الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

مواقع کو استعمال کرنے کا نام دانائی ہے
اور مواقع کو برباد کرنے کا نام نادانی

نومبر ۱۹۸۸

شمارہ ۱۴۴

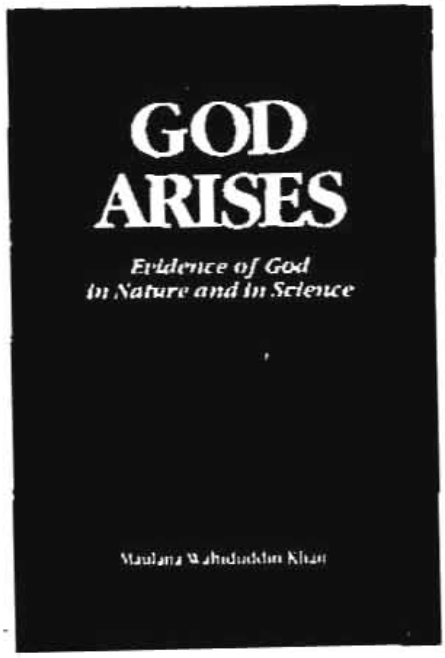

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۴ نومبر ۱۹۸۸

فہرست

	صفحہ		صفحہ
اپنا نقصان	۲	نیا مذہب	۱۱
عطیہ کارڈ	۳	مصلحت کی دو قسمیں	۱۲
تخریب نہیں	۴	انصاف زندہ ہے	۱۳
پختہ انسان	۵	سورج پر خاک	۱۴
لفظ کا فرق	۶	میرٹھ کا سفر	۱۷
اُلٹا کام	۷	امید افزا رجحان	۴۱
سب سے بڑا ظلم	۸	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۵
دین اکابر	۹	ایجنسی الرسالہ	۴۸
موت کے بعد	۱۰		

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

اپنا نقصان

اس دنیا میں سب سے بڑی چیز کیا ہے جس کو آدمی پائے۔ اور جس کو پانے کا خصوصی طالب بنے۔ یہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی خدائی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے۔ خدا کی رحمت کا فیضان ہر آن دنیا میں برستا ہے، مگر اس کو پانے والا وہی شخص ہے جس نے اپنے اندر پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو۔

جب ایک شخص پر تنقید کی جائے اور وہ تنقید کو سن کر بگڑ اٹھے تو اس نے اپنے آپ کو فیضان الٰہی سے محروم کر لیا، کیوں کہ تنقید کو سن کر بگڑنا کبر ہے، اور جس سینہ میں کبر ہو وہ سینہ کبھی فیضانِ الٰہی کا مہبط نہیں بن سکتا۔

یہی معاملہ تمام دوسری چیزوں کا ہے۔ ایک شخص کے سامنے حق بات واضح دلائل کے ساتھ پیش کی جائے مگر وہ اس کو نہ مانے اور دھاندلی کا انداز اختیار کرے، ایسا شخص کبھی خدا کی قربت کا تجربہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ خدا اعتراف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، دھاندلی کرنے والے لوگ اُسے پسند نہیں۔

آسمان سے بارش ہو تو زرخیز زمین اس کو قبول کرتی ہے۔ پانی اس کے اندر داخل ہو کر اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس سے فصل اگے، اس میں پھول اور پھل پیدا ہوں۔ مگر یہی بارش پتھر کی چٹان پر پڑتی ہے تو وہ اوپر اوپر بہہ جاتی ہے۔ وہ اس کو کچھ فائدہ نہیں پہونچاتی۔

یہی مثال خدائی فیضان کے معاملہ میں انسان کی ہے۔ خدا کا فیضان ہر لمحہ دنیا میں برس رہا ہے۔ تاہم اس کو وہی شخص پاتا ہے جس نے اپنے اندر اس کو پانے کی استعداد پیدا کی ہو۔ جس شخص کے اندر استعداد نہ ہو، اس کے اوپر خدا کا فیضان برسے گا مگر وہ پتھر کی چٹان کی طرح اوپر ہی اوپر سے گزر جائے گا۔ وہ اس کے سینہ کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ وہ اس کی روح میں شامل ہو کر اس کو روشن نہیں کرے گا۔

اپنے سینہ کے پتھریلے پن کو ختم کیجیے، اس کو نرم مٹی کی طرح بنا دیجیے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا سینہ ربانی فصل کا چمنستان بن گیا ہے۔

عطیہ کارڈ

۲۴ اگست ۱۹۸۸ کو مسٹر پی ڈی ملہوترا (پیدائش ۱۹۳۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) میں تقریباً ۳۰ سال سے پبلی کیشنز منیجر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز مجھے دفتر میں دیر ہوگئی۔ گھر جانے کے لیے باہر نکلا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اپنے اسکوٹر پر چلتے ہوئے ایک سڑک پر پہنچا تو وہاں پولس کے آدمی نے مجھے روک دیا۔ اس نے کہا کہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔

مسٹر ملہوترا نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیونگ کارڈ کے ساتھ ایک اور کارڈ نکل آیا اس نے اپنے ہاتھ میں دونوں کارڈ لیتے ہوئے پوچھا کہ یہ دوسرا کارڈ کیا ہے۔ یہ دراصل آنکھ کے عطیہ کا کارڈ (Eye Donor Card) تھا۔ اس کارڈ پر آدمی کے دستخط کے ساتھ اس کی طرف سے یہ الفاظ درج ہوتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھیں قوم کو عطیہ دی ہیں۔ براہ کرم میری موت پر سب سے قریب کے آنکھ کے اسپتال کو فوراً اطلاع کر دیں۔ اور میری خواہش کو پورا کرنے میں ان کی مدد کریں۔ شکریہ :

I have gifted my eyes to the nation. Kindly inform the nearest Eye Bank immediately on my demise and help them to fulfil my desire. Thanks.

پولس کا آدمی پہلے بہت رُکھائی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ مگر آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھتے ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے مزید جانچ کیے بغیر کہا کہ "جائیے، جائیے"۔

آنکھ کا عطیہ موجودہ زمانہ میں ایک شریفانہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی پر اس کی اپیل ان جذباتی لفظوں میں آتی ہے : "دنیا میں ایک ہی چیز ہے جو صرف آپ کسی کو دے سکتے ہیں"۔ پولس والے نے جب مسٹر ملہوترا کے پاس آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھا تو وہ سمجھا کہ یہ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔ آنکھ کے عطیہ کا کارڈ مسٹر ملہوترا کے لیے اس بات کی پہچان بن گیا کہ وہ دوسروں کو دینے والے آدمی ہیں۔ اس چیز نے پولس کے دل کو ان کے حق میں نرم کر دیا۔

اس دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے جو دوسروں کو دے وہ دوسروں سے پاتا ہے۔ حتی کہ وہ اس وقت بھی پانے کا مستحق بن جاتا ہے جب کہ اس نے ابھی عملاً دیا نہ ہو، اس نے ابھی صرف دینے کا ارادہ کیا ہو۔

تخریب نہیں

کورین ایر کی فلائٹ ۸۵۸ نومبر ۱۹۸۷ کی ۲۹ تاریخ کو بغداد سے اڑی۔ اسے سی اول پہنچنا تھا۔ وہ بحر انڈمان کے اوپر ۳۷ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہی تھی کہ اچانک دھماکا ہوا، اور اس کے ۱۱۵ مسافر فضا ہی میں ہلاک ہو گیے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ پائلٹ ایر پورٹ کو سگنل (Distress signal) بھی نہ بھیج سکا۔ جب کہ اس کے لیے صرف ایک سکنڈ کا وقت درکار تھا۔ جہاز کی تباہی کا یہ منصوبہ شمالی کوریا کی طرف سے بنایا گیا تھا۔ منصوبہ کے تحت شمالی کوریا کی ایک ۲۴ سالہ عورت کو تربیت دے کر جہاز کا سفر کرایا گیا۔ وہ بغداد سے اس جہاز پر سوار ہوئی اور جہاز کے اوپر کے خانہ میں ٹرانسسٹر بم رکھ کر ابوظبی میں اتر گئی۔ یہ ایک طاقت ور ٹائم بم تھا۔ وہ اپنے وقت پر پھٹا اور پورا جہاز اچانک تباہ ہو گیا۔

اس منصوبہ کا مقصد اولمپک ۱۹۸۸ کو ناکام بنانا تھا جو جنوبی کوریا کے دار السلطنت سی اول میں ہو رہا تھا۔ شمالی کوریا کی اشتراکی حکومت کو جنوبی کوریا کا یہ اعزاز پسند نہ تھا۔ شمالی کوریا کے اسٹالینی ڈکٹیٹر کم اِل سنگ (Kim Il Sung) نے اپنی خفیہ ایجنسی کو حکم دیا کہ جنوبی کوریا کے جہاز کو بم سے اڑا دو تاکہ جنوبی کوریا کا سفر لوگوں کو غیر محفوظ معلوم ہونے لگے اور لوگ اولمپک میں شرکت کا ارادہ چھوڑ دیں۔ اس تخریبی مقصد کے تحت مذکورہ جہاز کو برباد کیا گیا۔

جنوبی کوریا کے جہاز کو برباد کرنا نہایت بے ہودہ جرم تھا۔ مگر دہشت گردی کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ کوئی بھی ملک اس سے ڈر کر اولمپک کی شرکت سے نہیں رکا۔ اس کے برعکس، ۱۶۱ ملکوں نے اعلان کیا کہ وہ سب اس میں شریک ہوں گے۔ یہ تعداد کسی بھی پچھلے اولمپک سے زیادہ ہے:

> The destruction of KAL 858 was a monstrous crime, but as an act of terrorism it proved to be monumental failure. No country was frightened away from the Olympics. On the contrary, 161 countries have announced they will attend, more than at any previous Games.
>
> (*Reader's Digest*, August 1988

کسی کے خلاف تخریب کاری خود اپنے خلاف تخریب کاری ہے۔ ایسا آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے، وہ کسی دوسرے شخص کو کوئی نقصان نہیں پہونچاتا۔

پختہ انسان

این لینڈرس (Ann Landers) نے پختگی کے بارہ میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: پختگی یہ ہے کہ آدمی غصہ پر قابو پالے، اور اختلافات کو تشدد اور تخریب کے بغیر حل کرسکے۔ پختگی برداشت کا نام ہے، یہ آمادگی کہ دیرطلب فائدہ کے لیے وقتی خوشی کو ترک کردیا جائے۔ پختگی دراصل ثابت قدمی ہے، رکاوٹوں کے باوجود منصوبہ کی تکمیل کے لیے اپنی محنت جاری رکھنا۔ پختگی بے غرضی ہے، دوسروں کی ضرورتوں میں ان کے کام آنا۔ پختگی اس استعداد کا نام ہے کہ ناخوش گواری اور مایوسی کا سامنا کسی تلخی کے بغیر کیا جائے۔ پختگی انکساری ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کے قابل ہوتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا" اور جب وہ صحیح ثابت ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتادی تھی۔ پختگی کا مطلب ہے قابل اعتماد اور ایمان دار ہونا، اپنے وعدہ کو ہر حال میں پورا کرنا۔ پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ ہم ان چیزوں کے ساتھ پُرامن طور پر رہ سکیں جن کو ہم بدل نہیں سکتے:

Maturity is the ability to control anger, and settle differences without violence or destruction. Maturity is patience, the willingness to give up immediate pleasure in favour of the long-term gain. Maturity is perseverance, sweating out a project despite setbacks. Maturity is unselfishness, responding to the needs of others. Maturity is the capacity to face unpleasantness and disappointment without becoming bitter. Maturity is humility. A mature person is able to say, "I was wrong." And when he is proved right, he does not have to say, "I told you so." Maturity means dependability, integrity, keeping one's word. Maturity is the ability to live in peace with things we cannot change.

پختہ انسان وہ ہے جس میں مردانہ اوصاف پائے جائیں۔ جو حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرے۔ جو ردعمل سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرے۔ جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکے۔ جس کے اندر ناخوش گواری کو تحمل کے ساتھ عبور کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو لوہے کی طرح قابل اعتماد کردار کا حامل ہو۔

یہی پختگی انسانیت کا کمال ہے۔ جس انسان کے اندر یہ خصوصیات ہوں، وہی کامل انسان ہے۔ وہی انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک پہونچا ہے۔ ایسے ہی افراد زندگی میں کوئی حقیقی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ اور یہی افراد ہیں جو کسی قوم کو ترقی اور کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں۔

لفظ کا فرق

ہوائی جہاز چلانے کا کام بہت زیادہ تربیت کا طالب ہے۔ مگر اکثر پائلٹ مطلوبہ معیار سے کم ہوتے ہیں۔ حتی کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی۔ امریکی میگزین ٹائم (یکم اگست ۱۹۸۸) نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کی سرخی یہ ہے ——— کیا امریکی ہوا باز کوالیفائڈ ہیں :

Are U.S. pilots qualified (p. 39).

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی ہوائی کمپنیاں اکثر فیڈرل اویئیشن ایڈمنسٹریشن (FAA) کے سرٹیفکٹ پر بھروسہ کرکے پائلٹ کو بھرتی کر لیتی ہیں، خود زیادہ تحقیق نہیں کرتیں۔ مگر یہ بھروسہ کافی نہیں۔ ایک ریسرچ ٹیم نے ۱۱۲ ہوا بازوں کا جائزہ لیا تو ان میں ۵۰ فیصد ہوا باز معیار سے کم تر تھے۔

مثلاً ایک پائلٹ نے ۱۹۸۵ میں ایک ہوائی حادثہ کیا۔ اس کے ریکارڈ کا گہرا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے وہ تین مزید حادثات کر چکا تھا، اس کے باوجود اس کو بھرتی کر لیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے تینوں حادثات اس کی فائل میں حادثات (Accidents) کے بجائے محض واقعات (Incidents) لکھے ہوئے تھے۔

الفاظ کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ایک ہی واقعہ کو گھٹا کر بھی بیان کیا جا سکتا ہے اور بڑھا کر بھی۔ ایک قسم کا لفظ بولا جائے تو وہ معمولی نظر آئے گا، اور دوسرے قسم کا لفظ بولا جائے تو بے حد سنگین معلوم ہونے لگے گا۔ الفاظ کا معاملہ برجیسا ہے۔ اس میں کمی بیشی کا انحصار اس پر ہے کہ آپ نے اس کو کتنا کھینچا اور کتنا نہیں کھینچا۔

اس معاملہ میں مومن کے قول کو قولِ سدید ہونا چاہیے۔ قولِ سدید کا مطلب یہ ہے کہ بالکل لگتی ہوئی بات کہی جائے۔ ایسے الفاظ بولے جائیں جو اصل واقعہ کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوں، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ خاص طور پر جہاں دو شخص یا دو گروہ کے درمیان کا نزاعی معاملہ ہو وہاں تو عین مطابق واقعہ لفظ بولنا فرض کے درجہ میں مطلوب ہو جاتا ہے، اور غیر واقعی لفظ بولنا حرام کے درجہ میں غیر مطلوب۔

اُلٹا کام

ایک شخص اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہو اور اس سے کہے کہ تم پہلے بازار میں ایک دکان لے کر مطب کھول لو۔ اس کے بعد ڈاکٹری پڑھتے رہنا۔ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس قسم کا مشورہ دے تو لوگ اس کو پاگل یا کم از کم غیر سنجیدہ انسان سمجھیں گے۔ کیوں کہ ڈاکٹری پہلے سیکھی جاتی ہے اور مطب اس کے بعد کھولا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی الٹا کام ہمارے تمام لیڈر کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی انھیں غیر سنجیدہ نہیں کہتا۔ بلکہ انھیں مفکر اور رہنما کا خطاب دیدیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم لیڈر اٹھے وہ تقریباً سب کے سب قوم کو اسی قسم کی لاحاصل رہنمائی دیتے رہے ——— پہلے سیاسی آزادی حاصل کرلو، اس کے بعد قومی تعمیر کا کام کرنا۔ پہلے ایک زمینی خطہ حاصل کرلو، اس کے بعد وہاں اسلامی نظام جاری کرانا۔ پہلے حکومت کا تختہ الٹ دو، اس کے بعد اصلاحِ معاشرہ کا کام انجام دینا، پہلے پارلیمنٹ سے قانون پاس کرالو اس کے بعد لوگوں کی ذہنی اصلاح کرنا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتیں اتنی ہی بے معنی ہیں جتنا ڈاکٹری سیکھنے سے پہلے ڈاکٹری دکان کھولنا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت تک ہنگامہ آرائی کرنے کے باوجود مسلمانوں کے حصہ میں بربادی اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔

انسان کوئی لوہا یا لکڑی نہیں ہے جس کو مرحلہ وار گڑھا جاسکے۔ انسان ایک ہی بار بنتا ہے اور پہلی بار جیسا بن جائے اسی پر وہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خارجی انداز کی تحریکیں اپنے دوسرے مرحلہ کے منصوبہ میں ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔ خارجی نشانہ پورا کرنے کے بعد ان کے لیڈر افراد کی داخلی اصلاح پر تقریریں شروع کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تقریروں کا ایک فی صد بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کا تجربہ انسانی نفسیات سے بے خبری ہے۔ اور بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر نفسیاتِ انسانی سے اسی بے خبری کی مثال بنے ہوئے ہیں۔

تعمیر قوم حقیقۃً تعمیر شعور کا دوسرا نام ہے۔ شعور کی تعمیر کے بعد ہر چیز اپنے آپ حاصل ہوجاتی ہے، شعور کی تعمیر کے بغیر کوئی بھی چیز حاصل نہیں ہوتی۔

سب سے بڑا ظالم

فمن اظلم ممن كذب على الله وكذب بالصدق اذ جاءه اليس فى جهنم مثوىً للكافرين ۔ والذى جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون ۔ لهم مايشاؤن عند ربهم ذلك جزاء المحسنين ۔

(الزمر ۳۲-۳۴)

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ اور سچائی کو جھٹلا دیا جب کہ وہ اس کے پاس آئی ۔ کیا ایسے منکروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا ۔ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی ، یہی لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں ۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب ہے جو وہ چاہیں گے ۔ یہ بدلہ ہے نیکی کرنے والوں کا ۔

اس دنیا میں سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف ہے ، اور سب سے بڑا جرم حق کا انکار کرنا ہے۔ آخرت میں جنت اور جہنم کا فیصلہ جس معیار پر ہوگا وہ یہی ہوگا کہ ایک شخص کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کو مانا یا اس کو نظر انداز کر دیا۔ حق کو نظر انداز کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ اعتبار نہیں ۔

آدمی کا اصلی اور حقیقی امتحان جہاں ہو رہا ہے ، وہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی خاطر اپنی انا کو توڑا یا نہیں ۔ اس نے اللہ کے آگے اپنے عجز کا اقرار کیا یا نہیں ۔ حق کا ظہور در اصل اسی امتحان کا لمحہ ہوتا ہے ، اس دنیا میں حق کا ظہور چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ کسی انسان کے ذریعہ ہوتا ہے ، اس لیے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا اس کو اپنے لیے ساکھ کا مسئلہ بنا لیتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں حق کے آگے جھکا تو وہ ایک انسان کے سامنے جھکنے کے ہم معنی بن جائے گا ۔ یہ احساس اس کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے ۔

مگر ایسے مواقع پر جب آدمی جھکتا ہے تو وہ درحقیقت انسان کے آگے نہیں جھکتا ۔ وہ خدا کے آگے جھکتا ہے ۔ کیوں کہ وہ حق کی خاطر جھکا تھا نہ کہ کسی انسان کی خاطر ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جنتوں میں داخل کیے جائیں گے ۔

دینِ اکابر

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گیے، اور امت مسلمہ ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے ۷۲ فرقے آگ والے ہیں، صرف ایک جنت والا ہے۔ یہ ایک فرقہ "الجماعت" ہے (ابوداؤد) "الجماعت" سے کیا مراد ہے، اس کی تشریح ترمذی کی روایت سے ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، یہ الجماعت کون لوگ ہیں۔ آپ نے جواب دیا: جو اس پر ہو جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (مَنْ كَانَ عَلٰى مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ)

فرقوں کی یہ کثرت کیسے ہوتی ہے، اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: انھوں نے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ ان کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں (اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا، التوبہ ۳۱)

جب لوگ دینِ خدا پر ہوں تو دین ایک رہتا ہے۔ تمام لوگوں کے لیے دین کا ایک ہی ماخذ ہوتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ لوگ ہر معاملہ میں قرآن کی طرف دیکھتے ہیں اور اس میں جو ہدایت ملے اس کو بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ معلوم ہو جانے کے بعد وہ دوبارہ کوئی بحث نہیں نکالتے۔ جن لوگوں میں یہ مزاج ہو ان کا دین ایک رہے گا۔

مگر جب قوم میں زوال آتا ہے تو اس کے اکابر اس کے لیے دین کا ماخذ بن جاتے ہیں۔ اب قرآن کو یا تو ثواب اور تبرک کے طور پر پڑھا جاتا ہے یا اپنے اکابر کے دین کو صحیح ثابت کرنے کے لیے۔ خدا کی کتاب اصل رہنما کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیتی ہے۔

خدا ایک ہے مگر اکابر ایک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم جب دین اکابر پر ہوتی ہے تو اس کے یہاں فرقوں کی کثرت ہو جاتی ہے۔ ملت کا "۷۳ فرقوں" میں بٹنا دراصل "۷۳ اکابر" کے حلقوں میں تقسیم ہونے کا دوسرا نام ہے۔ مسلمان آج اسی دین اکابر پر ہیں۔ ان کے یہاں اکابر کے نام پر سرگرمیاں ہیں مگر خدا کے نام پر کوئی سرگرمی نہیں۔ اکابر کی بڑائی بیان کرنے سے ان کے زبان وقلم نہیں تھکتے مگر خدا کی بڑائی بیان کرنے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔

موت کے بعد

غزوہ بدر میں ابوجہل جب مہلک زخم کھا کر گرا اور مرنے کے قریب ہوا تو اس نے پوچھا کہ مجھ کو مارنے والا کون ہے۔ کسی نے بتایا کہ انصار کے ایک نوجوان نے اس کو قتل کیا ہے۔ ابوجہل یہ سن کر بولا: لو غیر اکّار قتلنی (کاش کسان کے علاوہ کسی اور نے مجھ کو مارا ہوتا)

ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ ڈنکرک (فرانس) کے ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ اس کا نام جوزف ریڈفورڈ (Joseph Redford) تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس نے مہلک زہر کی خوراک کھالی۔ اس کے بعد وہ مقامی کرکٹ کلب میں گیا تاکہ مرنے سے پہلے اپنے کلب کے ساتھیوں سے آخری مصافحہ کر سکے۔ اس نے کلب کے ممبروں سے کہا:

Give me a whisky, I shall be dead in half an hour.

مجھ کو شراب کا ایک گلاس دو۔ آدھ گھنٹہ کے بعد میں مر جاؤں گا (ہندستان ٹائمس، نئی دہلی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰)

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان موت کو بس "خاتمہ" کا ایک معاملہ خیال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ دن دنیا میں رہ کر ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا نام موت ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جب وہ مرے تو عزت اور سکون کے ساتھ مرے۔ اس کے مردہ جسم کے اوپر مقبرہ کی صورت میں ایک شاندار یادگار قائم ہو جو موجود لوگوں کو ختم ہونے والے انسان کی عظمت یاد دلاتی رہے۔

مگر یہ سخت ترین قسم کی غلط فہمی ہے۔ موت، آدمی کی زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ آدمی کی زندگی کے ایک نئے اور طویل تر دور کا آغاز ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو "قاتل" کا حسب نسب معلوم کرنے کے بجائے وہ خود اپنے اعمال نامہ کو پڑھنے کی کوشش کرے، وہ بے خودی کی خوراک کھا کر بے خبر ہونے کے بجائے یہ چاہے کہ وہ آخری حد تک باہوش ہو جائے تاکہ کم از کم اپنے آخری لمحات کو ضائع ہونے سے بچا سکے۔

کتنا زیادہ فرق ہے بے خبر انسان اور باخبر انسان میں۔

نیا مذہب

دہلی یونیورسٹی کے یونیسکو کلب کے تحت ایک میٹنگ ہوئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۳ اگست ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، اس موقع پر مسٹر خوشونت سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ضرورت ہے کہ ملک میں ایک نیا مذہب بنایا جائے جو کہ عمل کی اخلاقیات، عدم تشدد اور قدرتی ماحول کی حفاظت کی تبلیغ کرے۔ یہ بہت ضروری ہو گیا ہے، کیوں کہ لوگوں کے رجحان اور اقدار میں کچھ غلطی ہے جو کہ موجودہ مذاہب کے ذریعہ ان کے اندر آئی ہے:

There was need to form a new religion in the country which would propagate work ethics, non-violence and preservation of the environment. This has become imperative because there is something wrong with the attitudes and values of the people imbibed from the existing religions.

مسٹر خوشونت سنگھ نے موجودہ مذہبی لوگوں کی جو شکایت کی ہے، وہ بجائے خود درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مذہبی لوگ انسانی ترقی کا سبب بننے کے بجائے انسانی ترقی میں رکاوٹ بن گیے ہیں۔ وہ انسانی قافلہ کو آگے لے جانے کی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہی حال آج ہر مذہب کے ماننے والوں کا ہے۔

مگر جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے، اصل ضرورت نئے مذہب کی نہیں، بلکہ نئے مذہبی انقلاب کی ہے۔ مذہب کی تعلیم آج بھی صحیح ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد پر لوگوں کے اندر ذہنی انقلاب نہیں لایا گیا ہے۔ آج جو لوگ مذہب کی نمائندگی کر رہے ہیں وہ جمود اور تقلید کی پیداوار ہیں نہ کہ حقیقۃً مذہبی انقلاب کی پیداوار۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ مذہب کا نعرہ لے کر اٹھے، انھوں نے صرف مذہب کو استعمال کیا۔ انھوں نے مذہب کے مطابق لوگوں کا ذہن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی خرابی کا اصل سبب ہے۔ اب جن لوگوں کو اصلاح کا درد ہو۔ انھیں مذہبی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کا ذہن بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے، نہ یہ کہ نیا مذہب پیدا کرنے کی بے فائدہ کوشش میں اپنا وقت ضائع کریں۔

مصلحت کی دو قسمیں

شریعت انسان کی بھلائی کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے پوری شریعت مصلحت انسانی پر مبنی ہے۔ تاہم شریعت کے نزدیک بعض مصلحتیں قابل لحاظ ہیں اور بعض مصلحتیں ناقابل لحاظ۔ اس بنا پر فقہاء اسلام نے مصلحت کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ مصالح معتبرہ، یعنی وہ مصلحت جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہو۔ اور مصالح ملغاۃ، یعنی وہ مصلحت جس کو شریعت نے لغو قرار دیا ہو۔

۱۔ جان کی حفاظت کے لیے شریعت نے قصاص کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح مال کی حفاظت کے لیے چوری کی حد مقرر کی ہے۔ یہ مصالح معتبرہ کی مثالیں ہیں۔ مصالح کی اس فہرست میں قیاس و استنباط کے ذریعہ اضافے کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ نے تقسیم وظائف کے لیے رجسٹر کا طریقہ رائج کیا جو پہلے موجود نہ تھا۔ یہ بھی استنباطی طور پر مصالح معتبرہ میں شمار کیا جائے گا۔

۲۔ میراث میں قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ مرد کو عورت سے دگنا حصہ دیا جائے (النساء ۱۱) اب اگر کوئی شخص بطور خود ایک وجہ نکال کر کہے کہ عورت اور مرد دونوں کو برابر برابر حصہ دینا چاہیے تو یہ مصالح ملغاۃ کی مثال ہوگی۔ یہ ایک لغو مصلحت ہوگی جس کا اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ وہ حکم شریعت سے براہِ راست ٹکراتی ہے۔

مصالح معتبرہ اور مصالح ملغاۃ کا تعلق صرف روایتی قسم کے مسائل سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے تمام مسائل سے ہے۔ مثلاً ہندستان میں جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے فرقہ کے ساتھ ٹکراؤ نہ کرو۔ بلکہ قرآنی تعلیم کے مطابق، اعراض کا طریقہ اختیار کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اگر ہم اعراض کریں تو وہ جری ہو جائیں گے اور ہمارے خلاف مزید کارروائیاں کریں گے۔ مسلمانوں کی یہ مصلحت بھی مصالح ملغاۃ میں شامل ہے، کیوں کہ وہ ان کے اپنے دماغ کی ایجاد ہے، وہ قرآن کی کسی تعلیم یا پیغمبر کی کسی سنّت پر مبنی نہیں

وہی مصلحت معتبر مصلحت ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو، جو مصلحت قرآن و سنت کے مطابق نہ ہو وہ ایک لغو مصلحت ہے، جس کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی مصلحت مسلمانوں کو کبھی فلاح و سعادت کی طرف نہیں لے جا سکتی۔

انصاف زندہ ہے

ہندستان کی سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو ان کی نئی دہلی کی رہائش گاہ میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قتل میں چار آدمی ملوث تھے۔ حفاظتی دستہ کے بیانت سنگھ اور ستونت سنگھ۔ ان دونوں نے وزیر اعظم پر گولیاں چلائیں۔ بیانت سنگھ کو حفاظتی پولیس نے اسی وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور ستونت سنگھ گرفتار ہو گیا۔ دوسرے دو شخص کیہر سنگھ اور بلبیر سنگھ تھے جن کو قتل کی سازش کرنے اور اس کا منصوبہ بنانے کا مجرم قرار دیا گیا تھا۔

ان تینوں پر مقدمہ چلا۔ دہلی کے ایڈیشنل جج مہیش چندر نے ۲۲ جنوری ۱۹۸۶ کو اپنا فیصلہ سنایا جس میں ستونت سنگھ، کیہر سنگھ اور بلبیر سنگھ کو موت کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا۔ دہلی ہائی کورٹ نے ۳ دسمبر ۱۹۸۶ کے فیصلہ میں تینوں کے لیے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ اس کے بعد ملزمین اس مقدمہ کو سپریم کورٹ میں لے گیے۔ سپریم کورٹ نے ۳ اگست ۱۹۸۸ کو اپنا متفقہ فیصلہ سنایا۔ یہ فیصلہ مسٹر جسٹس جی ایل اوزا، مسٹر جسٹس سیٹی، مسٹر جسٹس بی سی رائے پر مشتمل ایک ڈویزنل بنچ نے سنایا۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں ستونت سنگھ اور کیہر سنگھ کی سزائے موت بحال رکھی۔ مگر بلبیر سنگھ کو اس نے مکمل طور پر بری قرار دیا۔ بلبیر سنگھ کے خلاف قتل میں ملوث ہونے کی براہِ راست شہادت نہیں ملی۔ مثلاً استغاثہ کی طرف سے ایک بات یہ کہی گئی تھی کہ مسز اندرا گاندھی کا قتل اس لیے ہوا کہ آپریشن بلیو اسٹار کی وجہ سے سکھ ان سے بگڑ گیے اور خود بلبیر سنگھ کی زبان سے انتقام کی بات سنی گئی۔ اس دلیل کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس اوزا نے لکھا ہے کہ اگر بلیو اسٹار آپریشن پر غصہ یا احتجاج کے اظہار کو ملزم کے خلاف شہادت یا قرینہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو سکھ فرقہ کے تمام افراد جو بلیو اسٹار آپریشن پر برہم ہو گیے تھے، ان سب کو قتل کی سازش میں شریک کرنا پڑے گا۔ مسٹر جسٹس اوزا نے مزید کہا کہ بلبیر سنگھ کو چھوڑنے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ اس کو سزا دینے میں غلطی کی جائے:

It is safer to err in acquitting than in convicting him.

اس واقعہ پر صرف وہ تبصرہ نقل کرنا کافی ہے جو بلبیر سنگھ نے کیا، اس نے کہا: مجھے انصاف کی ذرا بھی امید نہیں تھی۔ مگر اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس ملک میں انصاف زندہ ہے۔

سورج پر خاک

سلمان رشدی بمبئی میں پیدا ہوئے۔ اب وہ اپنی برطانی بیوی میریانے وگنس (Marianne Wiggins) کے ساتھ لندن میں رہتے ہیں۔ ان کی کئی انگریزی کتابیں (ناولیں) اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور کتاب آدھی رات کے بچے (Midnight's Children) ہے جو ۱۹۸۱ میں شائع ہوئی ہے۔ حال میں ان کی ۵۴۷ صفحات کی ایک کتاب ایک برطانوی پبلشر وائکنگ پریس (Viking Press) نے شائع کی ہے جو لندن سے ۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ کو ریلیز کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام "شیطانی کلام" (The Satanic Verses) ہے۔

مصنف نے کتاب کا نام (شیطانی کلام) بطور خود اس کے اساسی کردار "محاونڈ" (Mahound) کی نسبت سے استعمال کیا ہے جو کہ نعوذ باللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ نام کتاب کے مفروضہ کردار کے بجائے خود کتاب کے مصنف کے اوپر زیادہ صحیح طور پر چسپاں ہوتا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنے ایک بیان (ٹائمس آف انڈیا ۸ اکتوبر ۱۹۸۸) میں کہا ہے کہ یہ کتاب مذہب اور الہام کے بارے میں ایک سیکولر آدمی کا نقطۂ نظر بیان کرنے کی ایک کوشش ہے:

Its's an attempt to write about religion and revelation from the point of view of a secular person.

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ ایک سیٹانک پرسن (Satanic person) کے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کی کوشش ہے۔ کیوں کہ سیکولرزم، یا سیکولر انسان کا یہ مطلب کسی بھی سنجیدہ صاحب علم نے کبھی نہیں بتایا جس کا نمونہ سلمان رشدی نے اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایک انتہائی بیہودہ اور فحش قسم کا ناول ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں حمزہؓ اور عائشہؓ وغیرہ کے نام تو بالکل اصل حالت میں درج کئے گئے ہیں، البتہ پیغمبر کا نام محمدؐ کے بجائے محاونڈ (Mahound) لکھا گیا ہے۔ یوروپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے قدیم زمانہ میں اپنے جذبۂ عناد کی تسکین کے لئے آپ کے نام کو طرح طرح

سے بگاڑا تھا۔ انھیں میں سے ایک بگڑا ہوا نام وہ ہے جس کو سلمان رشدی نے انتہائی مجرمانہ طور پر اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسل انسانی کی بزرگ ترین شخصیت ہیں۔ آپ کی ذات گرامی بلاشبہہ پوری انسانیت کے لئے فخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی عظمت اور آپ کا تقدس اتنا زیادہ مسلّم ہے کہ دنیا کے تمام سنجیدہ لوگوں نے متفقہ طور پر اس کا اقرار کیا ہے۔

آپ کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ابدی طور پر فتح و غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ قدیم عرب میں ہر قسم کی شدید ترین مخالفت کے باوجود آپ تمام قبائل کے اوپر مکمل طور پر غالب رہے۔ آپ کے زمانہ کی دو طاقت ور ترین سلطنتیں (روم اور ایران) آپ سے ٹکرائیں مگر وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔ آپ کے ظہور کے بعد یہودی اور عیسائی ساری دنیا میں آپ کے دشمن ہو گئے، مگر وہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔

صلیبی جنگوں کے بعد یوروپ کی مسیحی اقوام نے متحدہ طور پر یہ کوشش کی کہ وہ آپ کی تصویر کو بگاڑیں اور آپ کی تاریخ کو بالکل مسخ کر ڈالیں۔ مگر ہزار برس تک اپنی ساری طاقت خرچ کرنے کے باوجود ان کی کوششیں صد فی صد ناکام ہو گئیں۔ یہاں تک کہ سائنس کے زیر اثر خود علم انسانی میں وہ انقلاب آیا جس نے آپ کے معاندین کے پیدا کردہ لٹریچر کو غیر حقیقی قرار دے کر رد کر دیا۔ خود مسیحی طبقہ کی بعد کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ابتدائی نسلوں کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں ٹامس کارلائل پیدا ہوا جس نے آپ کو تمام پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا (۱۸۴۰) ان کے درمیان سے مائیکل ہارٹ اٹھا جس نے یہ اعلان کیا کہ محمدؐ تاریخ کے واحد سب سے بڑے انسان تھے (۱۹۷۸) وغیرہ۔

جو ہستی اتنی عظیم ہو اور جس کی بڑائی ایسا مسلّمہ واقعہ بن چکی ہو، اس کے خلاف کتاب لکھنا یا اس کی شان میں برے کلمات اپنی زبان سے نکالنا یقیناً ایسا ہی ہے جیسا سورج کے اوپر خاک ڈالنا۔ جو شخص سورج کے اوپر خاک ڈالنے کی کوشش کرے وہ خود اپنے منھ میں خاک ڈال رہا ہے، وہ خود اپنے آپ کو باطل ثابت کر رہا ہے۔

کتا اگر ہاتھی کے اوپر بھونکے تو ہاتھی کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کتے کی بھونک کی

تردید کرے۔ ہاتھی اپنے باعظمت وجود کے ساتھ اپنے آپ کتے کی بھونک کی تردید ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کسی کے قلم کی سیاہی اس کو داغدار کر سکے۔ ساری تاریخ، تمام انسانی علوم، حتی کہ پوری کائنات ایسی ہر کوشش کی تردید ہے۔ جس ہستی کے ظہور نے خود انسانی تاریخ کو بدل ڈالا ہو، کون ہے جو اس کی تصویر کو بدلے، کون ہے جو اس کی تاریخ کو مٹا سکے۔

خاتونِ اسلام

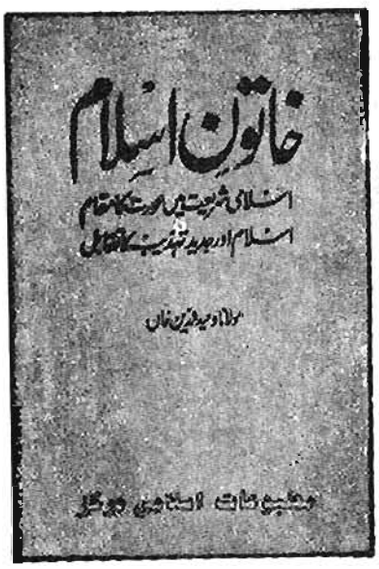

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

(صفحات ۲۹۲، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

میوات کا سفر

صفحات ۲۲۰ ھدیہ ۲۵ روپیہ

میرٹھ کا سفر

جہاں تک یاد آتا ہے، "میرٹھ" کا لفظ پہلی بار میرے کان میں اس وقت آیا جب کہ میری عمر ابھی دس سال سے کم تھی۔ اقبال احمد سہیل (۱۸۸۷-۱۹۵۵) کے بڑے صاحبزادے اسلام احمد خاں صاحب کی شادی مسٹر عبدالغنی انصاری (سابق کمشنر انکم ٹیکس) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون اپنے والد کے ساتھ میرٹھ میں تھیں۔ ۱۹۳۱ میں ان کے یہاں اکرام احمد خاں صاحب کی پیدائش ہوئی جو اقبال احمد سہیل کے پہلے پوتے ہیں۔ اس پیدائش کی خبر اعظم گڈھ پہونچی تو اقبال احمد سہیل صاحب نے برجستہ یہ شعر کہا:

زہے نصیب یہ دن بعد انتظار آیا　　پیام عیش کا میرٹھ سے آج تار آیا

میرا تعلق اس نسل سے ہے جس نے ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴-۱۹۱۷) کی ریڈریں پڑھی ہیں۔ ایک زمانہ میں ابتدائی مدارس میں سب سے زیادہ اسی "اردو ریڈر" کا رواج تھا۔ اس کے بعد ابتدائی اردو نصاب کے لیے بے شمار کتابیں لکھی اور چھاپی گئی ہیں جو آج کل عام طور پر رائج ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ میرٹھ کے مولانا محمد اسماعیل کی ریڈر سے بہتر کتاب اس موضوع پر اب تک نہ لکھی جا سکی۔ میں اپنی ابتدائی زندگی میں جن چیزوں سے متاثر ہوا ان میں مولانا اسماعیل میرٹھی کے مضامین اور اشعار بھی تھے۔ ان کے جو اشعار مجھ کو ابھی تک یاد ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل　　تو گھس جائے بے شبہہ پتھر کی سل

میرٹھ کے لیے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۶۸ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی ۹ فروری ۱۹۶۸ میں شائع ہوئی تھی۔ ۲۸-۲۹ جنوری ۱۹۶۸ کو میرٹھ میں ایک مسلم کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں "مشاہد" کے طور پر شریک ہوا تھا۔ اس موقع پر عین جلسہ کے دوران فرقہ وارانہ فساد ہو گیا اور شہر میں کرفیو لگ گیا۔ اس بنا پر کانفرنس صرف ۲۸ جنوری کو ہو سکی۔ کرفیو کی وجہ سے اگلے دن (۲۹ جنوری) کا اجلاس منسوخ کرنا پڑا۔

اس فساد کا سبب سابق کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ (۱۹۰۵-۱۹۸۲) کی اس میں شرکت

تھی۔ یہ شیخ عبداللہ کا وہ دور ہے جب کہ ان کا کہنا تھا کہ کشمیر کا ہندستان سے الحاق مکمل نہیں ہے، اس کے لیے کشمیری عوام سے استصواب رائے کیا جانا چاہیے۔ اپنے اس موقف کی وجہ سے وہ ہندستان کے اکثریتی فرقہ کی نظر میں ایک غیر مطلوب شخصیت بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب اعلان ہوا کہ وہ میرٹھ آرہے ہیں تاکہ مسلمانوں کے اجلاس کو خطاب کریں تو اکثریتی فرقہ کے انتہا پسند طبقہ میں اشتعال پیدا ہوگیا جو بالآخر فرقہ وارانہ فساد اور پولیس فائرنگ تک جا پہونچا۔

شیخ عبداللہ کو مسلم کانفرنس میں بلانے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ان کے نام پر بڑا مجمع اکٹھا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شیخ عبداللہ کا نام سن کر بے شمار مسلمان جلسہ گاہ میں جمع ہوگیے۔ بھیڑ جمع کرنے کی یہ تدبیر آج مسلمانوں میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ مزید یہ کہ اب اس فہرست میں بیرونی شخصیتوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ تاہم اس قسم کی بھیڑ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے زہر ہے۔ یہ شخصی یا جماعتی مفاد کی خاطر پوری ملت کے مفاد کو قربان کرنے کے ہم معنی ہے۔ اِس دنیا میں اُس سے زیادہ نادان کوئی شخص نہیں جو چُپ رہنے کے موقع پر بولے اور اخفار کے موقع پر اعلان کرے۔

میرٹھ کے لیے میرا دوسرا سفر جون ۱۹۷۹ میں ہوا۔ اس موقع پر وہاں میری چند تقریریں ہوئیں اور مختلف اہلِ علم سے ملاقاتیں ہوئیں۔

اس سفر کا ایک واقعہ اللہ اکبر (صفحہ ۹۰) میں درج ہے۔ ۳ جون ۱۹۷۹ کو میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی (صدر مدرس مدرسہ امداد الاسلام) ایک رکشہ پر بیٹھے ہوئے جارہے تھے۔ ہم صدر بازار کی سڑک سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہمارے سامنے کے مکان کا اگلا حصہ دھماکے کے ساتھ سڑک پر گر پڑا۔ ہمارا رکشہ اس مقام سے بمشکل چند گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ مکان اگر چند سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً اس کا پورا ملبہ ہمارے اوپر آجاتا اور ہم دونوں کا سفرِ حیات اچانک اسی سڑک پر ختم ہوجاتا۔

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر آدمی کسی نہ کسی حادثہ کے عین کنارے کھڑا ہوا ہے۔ آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف چند سکنڈ کا فاصلہ ہے ــــ انسان کی زندگی کتنی کم ہے، مگر بے خبر انسان اس کو کتنا زیادہ سمجھ لیتا ہے۔

میرٹھ کے لیے میرا تیسرا سفر جون ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر خاص طور پر میرٹھ کے فساد

کا جائزہ لینے کے لیے کیا گیا تھا۔ میرٹھ کا فساد محض ایک فساد نہیں، وہ ایک علامتی واقعہ ہے۔ اس کی روشنی میں ملک کی موجودہ صورت حال کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا تجزیہ کر کے ہندستانی مسلمانوں کے لئے راہ عمل کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

میرٹھ ہندستان کا ایک قدیم شہر ہے جو دہلی سے ۷۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ میرٹھ میں انگریزوں کے زمانے سے بہت بڑی فوجی چھاؤنی ہے۔ میرٹھ کو سب سے زیادہ شہرت ۱۸۵۷ میں ہوئی جب کہ یہاں کی ہندستانی فوج کے کچھ سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جس کو عام طور پر غدر (۵۹-۱۸۵۷) کہا جاتا ہے۔

انگریزوں نے اسی سال فوج میں نئے قسم کی رائفل کا استعمال شروع کیا تھا جس کو انفلیڈ رائفل (Enfield rifle) کہا جاتا ہے۔ اس رائفل میں کارتوس استعمال کیے جاتے تھے۔ ۲۴ اپریل ۱۸۵۷ کو جنرل اسمائتھ نے حکم دیا کہ میرٹھ کے سپاہیوں کو نئی رائفل کے استعمال کی تربیت دی جائے۔ مگر اسی زمانہ میں ان کارتوسوں کے بارہ میں ایک افواہ پھیل گئی۔ چنانچہ پانچ سپاہیوں کے سوا سب نے یہ کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ ان باغی سپاہیوں کی تعداد ۸۵ تھی جن میں ۴۹ مسلم تھے اور ۳۶ غیر مسلم۔ فوجی عدالت نے ان سپاہیوں کو قید بامشقت کی سزا دے کر جیل میں بند کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد دیسی سپاہیوں کے درمیان شدید نفرت پھیل گئی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ کی شام کو جب گرجا گھر کا گھنٹہ بجا اور عیسائی افسران گرجا چلے گئے تو ہندستانی رسالے نے جیل کا دروازہ توڑ کر تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا اور اعلان جنگ کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرٹھ میں بعض انگریز افسروں کے بنگلوں کو لوٹ لیا گیا اور بعض انگریزوں کو قتل کر دیا گیا۔

میرٹھ کے انقلابی سپاہی جب دہلی پہونچے تو یہاں بھی شورش پیدا ہو گئی۔ انھوں نے شہر پر "قبضہ" کر لیا۔ بہادر شاہ کے شہنشاہ ہندستان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ بادشاہ کے ایک بیٹے کو انقلابی فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ مگر بغاوت کو منظم کرنے کی صلاحیت نہ باپ میں تھی اور نہ بیٹے میں۔ مزید یہ کہ انقلابی فوج کے پاس وسائل کے نام سے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ بھنے ہوئے چنے بھی میسر نہ تھے جن کو کھا کر سپاہی اپنی بھوک مٹا سکیں۔ نہ بہادر شاہ کے پاس کوئی

خزانہ تھا اور نہ ہی دہلی کے دولت مند لوگ ان کو قرض دینے کے لیے تیار تھے۔ ایسی حالت میں اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا کہ یہ بغاوت کامیاب ہو۔

دوسری طرف انگریز کے پاس تنظیم بھی تھی اور وسائل بھی۔ اسی کے ساتھ انگریزوں نے جنید، پٹیالہ اور آس پاس کی سکھ ریاستوں سے امداد کی اپیل کی۔ سکھ چونکہ اورنگ زیب (۱۷۰۷-۱۶۱۸) کے زمانہ سے مسلمانوں سے بیزار تھے، وہ فوراً انگریزوں کا ساتھ دینے پر راضی ہو گیے۔ یہ در اصل سکھ ہی تھے جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہو کر لال قلعہ پر انگریزوں کو قبضہ دلوایا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ جب ہندستان میں ۱۸۵۷ کی بغاوت ہوئی تو پنجاب کا صوبہ انگریزوں کا وفادار رہا۔ سکھوں نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس وفاداری کی بھاری قیمت سکھوں کو ملی۔

اس کے بعد انگریزی حکومت نے سکھوں کو زمینیں دیں۔ انگریزی فوج میں سکھوں کا تناسب بڑھا دیا گیا۔ ایک ضابطہ منظور کیا گیا جس کے تحت سکھ فوجیوں کو یہ آزادی تھی کہ وہ خالصہ روایات پر عمل کر سکیں۔ پنجاب میں نہروں کا وسیع نظام قائم کیا گیا جس کے نتیجہ میں سکھوں کی ریاست پنجاب میں ایسی خوش حالی آئی جو اب تک اس علاقہ میں دیکھی نہیں گئی تھی۔ سکھوں کے ساتھ انگریزوں کا معاملہ نہایت فیاضانہ رہا۔ پنجاب میں یہ حال ہوا کہ انیسویں صدی کے خاتمہ پر اگرچہ سکھوں کی تعداد صرف ۱۲ فی صد تھی مگر وہ صوبہ کی مال گزاری کا ۲۵ فی صد حصہ ادا کر رہے تھے۔ اور مال گزاری اور پانی کا ٹیکس ملا کر سرکاری مالیہ میں ان کا حصہ ۴۰ فی صد تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت برطانی فوج میں سکھوں کی تعداد ۲۰ فی صد تھی (جلد ۱۶، صفحہ ۷۴۵)

۱۸۵۷ میں جو واقعہ میرٹھ میں پیش آیا اس میں ایک پہلو شوشہ کا تھا، اور دوسرا پہلو وہ تھا جو حقیقی تھا۔ مسلمان واقعہ کے اصل پہلو پر دھیان نہ دے سکے، وہ شوشہ والی بات میں الجھ کر رہ گیے۔

ابتدائی زمانہ میں بندوقیں اور رائفلیں غیر توڑے دار ہوتی تھیں۔ ان کو منہ کی طرف سے بھری جانے والی (Muzzle-loader) - رائفل کہا جاتا تھا۔ اس طریقہ میں گولی کو رائفل کی نالی کے آخری سرے سے ڈال کر گز کے ذریعہ اندر داخل کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ دشوار طلب تھا اور اس میں

تیز رفتار فائرنگ ممکن نہ تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں پہلی بار وہ بندوقیں اور رائفلیں بنائی گئیں جن کو توڑے دار (Breech-loader) رائفل کہا جاتا ہے۔ ان رائفلوں میں کارتوس استعمال ہوتے تھے جو کندا اور نالی کے درمیان رائفل کو توڑ کر بھرے جاتے تھے۔ ان رائفلوں کو عام طور پر انفیلڈ رائفل (Enfield rifle) کہا جاتا ہے۔

یہ رائفل کی دنیا میں ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اس وقت دہلی کی سلطنت قائم تھی۔ ملک میں متعدد مسلم ریاستیں موجود تھیں۔ مگر کسی نے بھی یہ غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس نئی دریافت کو سمجھا جائے جو مشرق اور مغرب کے درمیان فوجی توازن کو توڑ دینے کے ہم معنی ہے۔ البتہ ایک معمولی سی بات پر ایک ایسا ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا جس کا بدترین خمیازہ سب سے زیادہ خود مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔

انفیلڈ رائفل میں ابتداءً جو کارتوس استعمال ہوتے تھے ان میں برائے ضرورت گریز (Grease) لگی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ گریز حیوانی چربی سے تیار کی گئی تھی۔ ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے پہلے انھیں کھولنا پڑتا تھا۔ اس کی ایک آسان صورت (نہ کہ واحد صورت) یہ تھی کہ ان کو دانت سے کاٹ کر کھولا جائے۔ اس طرح لوگوں کو ایک شوشہ مل گیا۔ یہ مشہور کیا گیا کہ یہ گریز سور اور گائے کی چربی سے بنائی گئی ہے اور ان کو فوج میں اس لیے رائج کیا گیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو بے دین (ادھرم) بنا دیا جائے۔ اب فوجیوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے دھرم اور مذہب کو بچانے کے لیے بغاوت کر دیں۔

کارتوس کے بارہ میں مذکورہ افواہ کتنی سخت ثابت ہوئی، اس کا ذکر مسٹر اچیسن (Atchison) نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ اس آتش گیر مادہ پر کارتوس کی مبالغہ آمیز کہانی اس طرح گری جیسے سوکھی لکڑی پر آگ کی چنگاری گرے، اور پورا ملک ستلج سے لے کر نرمدا تک جل اٹھا:

On this inflammable material, the too true story of the cartridges fell as a spark on dry timber, and the whole country from the Sutlej to the Narmada was ablaze.

غور کیجیے تو اسی ایک واقعہ میں ملت کی پچھلے ڈیڑھ سو سال کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں نے لاتعداد طوفانی تحریکیں چلائیں۔ مگر سب کا خلاصہ یہ تھا کہ لوگوں کو شوشہ والا

پہلو تو مبالغہ کے ساتھ نظر آیا۔ مگر واقعہ کا جو اصلی اور حقیقی پہلو تھا اس کو دیکھنے سے وہ صد فی صد قاصر رہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی واحد وجہ ان کے اصاغر و اکابر کی یہی غفلت ہے نہ کہ سازش کی وہ کہانیاں جو ہم نے بطور خود گھڑ رکھی ہیں تاکہ اپنی بربادی کی ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال سکیں۔

میرٹھ کے فسادات کے بارہ میں اردو اور انگریزی اخبارات میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود وہاں جاؤں، واقعات کو اپنی آنکھ سے دیکھوں اور لوگوں سے براہ راست معلومات حاصل کروں۔

۲۸ جون ۱۹۸۷ کی صبح کو میں ساڑھے تین بجے بستر سے اٹھ گیا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔ پہلی رکعت میں سورہ والضحیٰ اور دوسری رکعت میں سورہ الم نشرح کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میری زبان سے نکلا: خدایا، میرے اس سفر کو اپنی مرضی کا سفر بنا دیجئے۔ یہی احساس لے کر میرٹھ کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں بھی یہی دعائیں نکلتی رہیں کہ میرا یہ سفر میرے لئے سفر حج بن جائے۔ ۲۸ جون کی صبح کو میں دہلی سے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ مزید حسب ذیل افراد تھے:

رئیس الاسلام میرٹھی، ایم اے، ایل ایل بی (پیدائش ۱۹۴۸)

محفوظ علی خاں، ایم اے (پیدائش ۱۹۵۴)

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں (پیدائش ۱۹۵۹)

ڈیڑھ گھنٹہ جی ٹی روڈ پر سفر کرنے کے بعد ہم منزل پر پہنچے۔ "یہ میرٹھ ہے" میرے ساتھی نے کہا اب دونوں طرف عمارتیں نظر آنے لگیں۔ ہم کئی میل تک میرٹھ کے اندر چلتے رہے۔ مگر وہ فساد زدہ میرٹھ نظر نہیں آیا جس کی تصویریں اخباروں میں دیکھی تھیں۔ یہاں تک کہ ہم ان علاقوں میں پہنچے جو فساد کے دوران جلائے اور پھونکے گئے تھے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کیا وجہ ہے کہ بڑی بڑی سرکاری شخصیتیں میرٹھ آتی ہیں مگر وہ اس سے حقیقی تاثر لئے بغیر واپس چلی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فساد زدہ حصہ کمیت کے اعتبار سے کل میرٹھ کا بہت تھوڑا حصہ ہے۔ اب ایک شخص اگر ہیلی کاپٹر سے آئے اور مجموعی میرٹھ پر طائرانہ نظر ڈال کر چلا جائے تو وہ اپنے مشاہدہ کی نسبت سے اصل واقعہ کا اتنا کم تاثر لے گا کہ واپس پہنچتے پہنچتے وہ اس کے ذہن میں ایک دھندلی یاد سے زیادہ باقی نہ رہے ——

اخباری میرٹھ اور رپیلی کا پڑوالے میرٹھ میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

میرٹھ پہنچ کر میں نے ان مقامات کو دیکھا جو اپریل اور مئی کے فسادات میں متاثر ہوئے ہیں۔ شہر کے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ عوام بھی تھے اور اعلیٰ مناصب کے لوگ بھی۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میرٹھ میں جو کچھ ہوا اس کی روداد میں اردو اور انگریزی اخبارات میں کافی تفصیل سے پڑھ چکا ہوں۔ یہاں میں نے اپنی آنکھوں سے بھی ان کو دیکھ لیا ہے۔ اسی طرح "کیا ہوا" کے بارہ میں میں کافی جان چکا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے "کیوں ہوا" کے بارہ میں بتائیں۔ مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ تمام جاننے والے یہی بات نہیں جانتے۔ یہاں کے لوگ بس "کیا ہوا" کو جانتے ہیں اور باہر سے آنے والے لوگ بھی کیا ہوا کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ "کیوں ہوا" سے نہ مقامی لوگوں کو دلچسپی ہے اور نہ باہر سے آنے والوں کو۔

میرٹھ کی کہانی اجودھیا کی بابری مسجد کی کہانی سے شروع ہوتی ہے۔ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی جھگڑا آزادی (۱۹۴۷) کے پہلے سے چلا آرہا تھا۔ عدالت نے ایک حکم کے تحت ۱۹۴۹ میں اس میں تالا لگا دیا گیا۔ ابھی مقدمہ چل رہا تھا کہ ضلع جج فیض آباد کے حکم سے پولیس نے یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کا تالا کھول دیا۔ اس کے بعد مسجد عملاً ہندو فرقہ کے قبضہ میں چلی گئی۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ مسلمان اس معاملہ کو عدالت اور گفت وشنید کے دائرہ میں رکھ کر اپنی مہم جاری رکھیں۔ مگر مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر نہایت بے تابانہ طور پر اس کو سڑک پر لے آئے۔ مسلم اخبارات نے دھواں دھار مضامین شائع کرنا شروع کر دیا۔ سارے ملک میں پرجوش تقریریں کرکے مسلمانوں کے خون کو اس مسئلہ پر گرما دیا گیا۔ اس کے بعد "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کے فیصلہ کے مطابق اولاً ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ بعد کو اسے واپس لے لیا گیا اور اس کے بجائے ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو دہلی میں بابری مسجد کے نام پر مسلمانوں کی احتجاجی ریلی نکالی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی اور اطراف دہلی کے تقریباً ۵ لاکھ مسلمان بوٹ کلب (نئی دہلی) میں جمع ہوئے۔ وہاں مسلم لیڈروں نے ان کے سامنے دھواں دھار تقریریں کیں۔ اس کے بعد مسلمانوں میں جوش وخروش کا ایک لاوا ابل پڑا۔ وہ ریلی سے اس طرح لوٹے جیسے انھوں نے ہندستان کو دوبارہ فتح کر ڈالا ہو۔

یہ ریلی یقینی طور پر محض ایک وقتی بھیڑ تھی۔ مگر نادان مسلمانوں نے اس کو "بے نظیر اتحاد" کے

ہم معنی سمجھ لیا۔ اس کے لئے حد درجہ مبالغہ آمیز الفاظ بولے جانے لگے۔ ریلی کے موقع پر مسلم لیڈروں نے جو باتیں کہیں یا اس کے بعد مسلم اخباروں نے جو سرخیاں لگائیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

مسلمانوں کے بے مثال مظاہرے سے انڈیا گیٹ لرز اٹھا۔

۵ لاکھ فرزندان توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر: مسلمانوں کی تاریخ کا نیا موڑ

اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے پارلیمنٹ کے در و دیوار تھرا اٹھے

بابری مسجد اشو نے مسلمانوں کو متحد کرکے انھیں ناقابل تسخیر بنا دیا ہے

اب ہمیں طاقت کے بل پر اپنے مطالبات کو منوانا ہے

ہندستان کا مسلمان جاگ اٹھا، اب وہ کسی سے دبنے والا نہیں

انصاف نہ ہوا تو ہم دشمنان اسلام کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

حکومت کے رویہ نے سوئے ہوئے شیروں کو جگا دیا

"بابری مسجد واپس کرو" کے نعروں کی زد میں آکر فضا کے ہیلی کاپٹر اپنا توازن کھو بیٹھے

مسلمانوں نے اپنی طاقت کو از سر نو دریافت کرلیا ہے۔

نام نہاد مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کے نام پر فضا میں جو اشتعال پیدا کیا اسی کا براہ راست نتیجہ میرٹھ کا فساد تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فساد کی مکمل ذمہ داری مسلم لیڈروں پر ہے، مگر انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کو ہندو فرقہ پرستوں یا انتظامیہ کے سر پر ڈال دیا ہے۔

بابری مسجد کی ریلی میں زیادہ تر یوپی کے لوگ تھے۔ خاص طور پر میرٹھ کے لوگ اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اور ذہنی طور پر تو میرٹھ کے تقریباً تمام مسلمان اس مہم میں شریک تھے۔ میرٹھ کے ایک مسلمان نے کہا کہ اگر سواری کی رکاوٹیں نہ ہوتیں تو میرٹھ سے کم از کم پچاس ہزار مسلمان اس ریلی میں جاتے۔ ایک ہندو نے کہا کہ "میرٹھ کا مسلمان بابری مسجد کے معاملے میں بہت زیادہ سیوگ دیتا ہے۔"

ان مسلمانوں نے ریلی کو دیکھ کر اپنی طاقت کا احمقانہ حد تک غلط اندازہ لگایا۔ بوٹ کلب پر مسلمانوں کی بھیڑ اور مسلم مقررین کی پرجوش تقریروں اور مسلم اخبارات کی مبالغہ آمیز سرخیوں سے وہ بھڑک اٹھے۔ ریلی کے بعد مسلمان اس احساس کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹے کہ اب انھیں

دب کر نہیں رہنا ہے بلکہ طاقت کے زور پر اپنے حقوق کو منوانا ہے۔ اس کے بعد مسلمان کھلم کھلا سکھوں والا طریقہ اختیار کرنے کی بات کرنے لگے۔ حتی کہ میرٹھ میں ایک شخص پیدا ہوگیا جو فخر کے ساتھ کہتا تھا کہ میں مسلمانوں کا بھنڈراں والا ہوں۔

ایم جے اکبر (ٹیلی گراف) نے لکھا ہے کہ میرٹھ میں ایک ۴۰ سالہ مسلمان نے اپنے بارہ میں یہ مشہور کیا کہ وہ مسلمانوں کا بھنڈراں والا ہے۔ اسی نام سے پکارنے میں اس کو ذہنی تسکین ملتی ہے۔ جب بابری مسجد کا متنازعہ شروع ہوا تو اس شخص نے مسلم نوجوانوں کو "مارنا ہے یا مرجانا ہے" کے نعروں پر متظم کرنا شروع کیا۔ اکثر اوقات وہ اپنی تقریروں میں یہ اعلان کرتا رہتا تھا کہ "ایک کروڑ سردار ہیں اور ان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے، پھر راجیو گاندھی ۲۰ کروڑ مسلمانوں کو کس طرح سنبھالیں گے۔"

اشتعال انگیزی کی یہ سیاست بوٹ کلب نئی دہلی پر بابری مسجد کی ریلی سے شروع ہوئی۔ اس ریلی میں یہاں تک کہا گیا کہ فریق ثانی کو ہندستانی مسلمانوں کے غصہ کے نتائج سے باخبر رہنا ہوگا۔

میرٹھ میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو مسلمانوں کے لیڈر پولیس اور حکومت کے خانہ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ وحشیانہ معاملہ تمام کا تمام خود مسلم لیڈروں کے خانہ میں جاتا ہے۔ کیوں کہ انھیں کی بد تدبیری کا یہ نتیجہ تھا جو مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ بابری مسجد کے نام پر انھوں نے اشتعال انگیز سیاست کا جو طریقہ اختیار کیا، یہ صرف اس کا ردعمل تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلم لیڈروں نے فریق ثانی کو بھڑکا کر مسلم عوام کے اوپر گولی چلوادی۔ اور جب خود گولی کھانے کا وقت آیا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

میرٹھ کے مصیبت زدگان میں بڑی تعداد ان مزدوروں کی تھی جو بہار سے تعلق رکھتے تھے۔ بہار کے بہت سے مزدور جن کو محلہ ملیان سے پکڑ کر فتح گڑھ جیل لے جایا گیا تھا، ان کے بیان کے مطابق پولیس نے تھانہ میں ان لوگوں پر لاٹھیاں برسائیں۔ جیل کے اندر قیدیوں سے بھی انھیں پٹوایا گیا۔ اس وحشیانہ مار پیٹ میں کئی آدمیوں کی موت واقع ہوگئی۔ ان بہاری حضرات نے بتایا کہ پولیس انھیں مارتے ہوئے یہ کہتی تھی:

لو بابری مسجد، بلاؤ اپنے لیڈروں کو، دیکھیں تمھیں کون بچاتا ہے۔

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے انھیں غضب ناک بنایا اور وہ وحشیانہ انتقام پر اتر آئے (نقیب ۲۰ جولائی ۱۹۸۷)

ان اسباب کے نتیجہ میں شمالی ہند، خاص طور سے یوپی میں سخت فرقہ وارانہ تناؤ کی فضا پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں نے (اور اسی طرح ہندوؤں نے بھی) باقاعدہ "تیاریاں" شروع کردیں۔ تاکہ موقع آنے پر ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف کارروائی کرسکے۔ اس بارود میں چنگاری لگنے کا پہلا واقعہ ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو میرٹھ میں پیش آیا۔

ڈاکٹر ہرپال سنگھ سے ایک انٹرویو میں سوال کیا گیا کہ فساد کی اصل ذمہ داری کس پر ہے۔ انھوں نے جواب دیا "اصل ذمہ دار رام جنم بھومی۔ بابری مسجد تنازعہ ہے۔ ایک جانب بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے پلیٹ فارم سے بھڑکیلی تقریریں کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف اخبارات میں مسلسل ایسے مضامین چھاپے جاتے ہیں جن میں ماضی میں مسلمانوں کے ذریعہ ہندوؤں پر ظلم وستم کا رونا رویا جاتا ہے۔ اس سے تناؤ بڑھتا ہے۔ لیکن حکومت روک تھام کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی" (افکار ملی یکم جون ۱۹۸۷ صفحہ ۲۲-۲۱)

مشتاق احمد رامپوری (عمر ۷۰ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو میں میرٹھ کے اس جلسہ میں موجود تھا جہاں سے فساد کے پہلے مرحلہ کا آغاز ہوا۔

ان کے بیان کے مطابق جو صورت واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ ۱۴ اپریل کو شاہ پیر گیٹ کی سڑک پر مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ یہ جلسہ شب برات کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسہ گاہ کے سامنے مین سڑک ہے اور اس سڑک کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ یہ مندر لودھوں والی گلی میں ہے۔ لودھے لوگ اس دن مندر میں اپنی کوئی تقریب منا رہے تھے اور ریکارڈنگ کر رہے تھے۔ اس کی تیز آواز مسلمانوں کے جلسہ تک پہنچ رہی تھی۔

مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ اس ریکارڈنگ سے ان کے جلسہ میں خلل پڑ رہا ہے۔ چنانچہ کچھ مسلم نوجوان وہاں گئے اور ان سے کہا کہ تم اپنا لاؤڈ اسپیکر بند کردو یا اس کی آواز کم کردو۔ انھوں نے کہا کہ تم ہی کرلو، ہم کیوں کریں۔ اس پر بات بڑھی۔ مسلمان غصہ میں آگئے۔ انھوں نے لودھوں کے لاؤڈ اسپیکر کو توڑ ڈالا اور انھیں مارنے پیٹنے لگے۔ شور سن کر جلسہ کے اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے بھی مار پیٹ

میں حصہ لیا۔ انھوں نے لودھوں کی ایک قریب کی ٹال میں آگ لگادی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سفر میں لوگوں کو نعرۂ تکبیر بلند آواز کے ساتھ کہنے سے منع فرمادیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے نازک مواقع پر "اللہ اکبر" کی دھوم بھی نہیں مچائی جو ایک ثابت شدہ اسلامی عمل ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انتہائی نازک موقع پر شب برات کی دھوم مچاتے ہیں، حالاں کہ دین میں شب برات کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے بعد اگر فساد ہوتا ہے تو مسلمانوں کو دوسروں کی نہیں خود اپنی شکایت کرنا چاہئے۔

میرٹھ میں جو فساد ہوا اس کے دو مرحلے تھے۔ ایک وہ جو ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو پیش آیا۔ دوسرا وہ جو ۱۸ مئی ۱۹۸۷ کو شروع ہوا۔ پہلا فساد شاہ پیر گیٹ سے شروع ہوا تھا، چنانچہ میرٹھ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے ہم اس مقام پر گئے۔ یہاں ہم مندر والوں سے بھی ملے تاکہ معلوم کریں کہ اس بارہ میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت مندر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے کے چبوترہ پر چند ہندو صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان سے مذکورہ واقعہ کے بارے میں سوالات کئے۔ مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بارے میں آپ کو ڈاکٹر جین بتائیں گے۔

ڈاکٹر جین کا مطب سڑک پر شاہ پیر گیٹ کے سامنے ہے۔ مگر اس وقت ان کا مطب بند تھا۔ دن میں کئی بار ہم وہاں گئے تاکہ ان سے گفتگو کریں مگر ہر بار ان کا مطب بند پایا۔

مندر والوں سے یا ڈاکٹر جین سے اگرچہ براہ راست معلومات نہ ہو سکی تاہم اس واقعہ میں ہمارے لئے ایک بہت بڑا سبق تھا۔ "مندر والوں" نے اپنا ایک ترجمان بنالیا ہے۔ خود جواب دینے کے بجائے وہ ہر ایک سے یہ کہتے ہیں کہ جاکر ان سے پوچھو۔ اس کے برعکس آپ مسجد میں چلے جائیں تو ہر "مسجد والا" یہ چاہے گا کہ سب سے پہلے وہی بولے۔

۱۴ اپریل کو جو فساد شروع ہوا اس کو مقامی انتظامیہ نے چند دن کے اندر کنٹرول کرلیا۔ تاہم دونوں فریقوں کی طرف تناؤ باقی رہا۔ میرٹھ میں پرنسپل نایاب زیدی نے بتایا کہ رمضان کے مہینہ میں ہماری ملاقات جس ہندو یا مسلمان سے ہوئی وہ یہ کہتا ہوا سنائی دیا کہ "پھر جھگڑا ہونے والا ہے"۔ لوگوں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ہر کمیونٹی کو احساس تھا کہ پچھلے فساد میں اس کا زیادہ

نقصان ہوا ہے، اس لئے دوبارہ اس کا بدلہ لینا ہے۔

افواہیں اور لیڈروں کی تقریریں اور اخبارات کے سنسنی خیز مضامین جذبات کو بھڑکاتے رہے۔ مئی کے تیسرے ہفتہ میں چند اشتعال انگیز واقعات ہوئے۔ یہاں تک کہ ۸ مئی کو دوسری بار شدید تر انداز میں فساد کا طوفان ابل پڑا۔

دہلی روڈ کے مسٹر سلیم بھارتی (عمر ۵۰ سال) نے دوسرے مرحلہ میں شروع ہونے والے فساد کے بارہ میں بتایا کہ ۱۶ مئی ۱۹۸۷ کو چھپی واڑہ میں ایک پٹاخہ (بقول بعض دستی بم) پھٹا۔ یہ پٹاخہ (یا بم) شیعہ امام باڑہ میں پھٹا تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ یہ پٹاخہ (یا بم) ہندو کی طرف سے پھینکا گیا ہے۔ ہندوؤں نے کہا کہ یہ خود مسلمانوں کی کارروائی ہے۔ اگلے دن پھر یہی واقعہ ہوا۔ یعنی پٹاخہ (یا دستی بم) دوبارہ اسی مقام پر پھٹا۔

انھوں نے بتایا کہ اسی چھپی واڑہ میں ایک پراپرٹی ہے جس کا مالک مسلمان ہے اور ہندو اس کا کرایہ دار ہے۔ دونوں میں کرایہ دار اور مالک کا جھگڑا چل رہا تھا۔ کرایہ دار کا چھوٹا بھائی اجے شرما اگلے دن اپنے بھائی سے ملنے کے لئے آیا۔ جب وہ واپس ہوا تو کسی نے اس کو گولی ماردی (ایک روایت ہے کہ یہ گولی مالک مکان نے ماری) اجے شرما اپنے اسکوٹر پر بھاگا۔ وہ قینچی والان میں پہنچا جو مسلمانوں کا محلہ ہے۔ مسلمانوں نے اس کو خون آلود حالت میں دیکھا تو انھوں نے سمجھا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے امام باڑہ میں دو دن پٹاخہ (یا بم) پھینکا ہے۔ آج بھی وہ اسی طرح پھینک رہا تھا مگر وہ خود زخمی ہوگیا۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ اس وقت اگر مسلمان اجے شرما کو فرسٹ ایڈ پہنچاتے تو یقیناً میرٹھ کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر انھوں نے اس کے برعکس عمل کیا۔ انھوں نے زخمی اجے شرما کو پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ پولیس آگئی اور وہ اجے شرما کو اپنے ساتھ لے گئی۔ مگر اجے شرما اسپتال پہنچ کر مرگیا۔

اجے شرما کو فرسٹ ایڈ پہنچانے کی صورت میں یہ ہوتا کہ شہر میں مسلمانوں کی شرافت اور انسانیت کی خبر گونجتی۔ مگر دوسری صورت میں شہر کے اندر مسلمانوں کے ظلم کی خبر گونجی۔ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر شہر میں سخت تناؤ پھیل گیا۔ اسپتال کے پاس مسلمانوں کے کچھ کھوکھے تھے، ان کو ہندوؤں کے ایک

مشتعل مجمع نے جلا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کی دکانوں پر حملہ کیا۔ آخر میں پولیس آئی اور اس نے وہ سب کچھ کیا جس کی خبریں تفصیل کے ساتھ اخبارات میں آچکی ہیں۔ یہ ناخوشگوار واقعہ ۱۸ مئی ۱۹۸۷ کو پیش آیا۔

مسٹر بھارتی نے بتایا کہ اس کے بعد گذری بازار میں ایک میٹنگ تھی جس میں مجسٹریٹ اور پولیس افسران شریک تھے۔ مسلمانوں نے اس موقع پر کہا کہ ہمارا محلہ جھگڑالو محلہ نہیں ہے۔ یہاں کبھی کچھ نہیں ہوا۔ ہم تو امن کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس پر ایک پولیس افسر نے کہا: "اجے شرما کا قتل کر کے سوئچ کو آن تو آپ ہی لوگوں نے کیا ہے"۔ واضح ہو کہ گذری بازار اور قینچی والان دونوں بالکل ملے ہوئے محلے ہیں۔

اسی روز رات کو سحری کے وقت پولیس محلہ ہاشم پورہ میں داخل ہوگئی۔ وہ گھروں کی تلاشی لے کر ہتھیار برآمد کرنا چاہتی تھی۔ جب یہ خبر پھیلی کہ ہاشم پورہ اور المیان (مسلم محلہ) میں پولیس داخل ہوگئی ہے اور سختیاں کر رہی ہے تو محلہ کے امام نے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر "جہاد" کی تقریر شروع کر دی۔ "حضرات، پی اے سی نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ لوگ مقابلہ کے لئے اپنے گھروں سے باہر آجائیں"۔ اس قسم کی تقریروں کے نتیجہ میں آس پاس کی آبادیوں سے بہت سے مسلمان نکل آئے۔ انھوں نے ہندو علاقوں پر حملہ کر دیا۔ امام نے پولیس سے "دفاع" کے لئے پکارا تھا، انھوں نے غیر متعلق ہندوؤں پر "ہجوم" کر دیا۔

یہاں انھوں نے ہندوؤں کی گاڑیاں جلائیں۔ ان کی دکانوں اور شوروموں پر حملے کئے۔ ہاپوڑ روڈ اور پلوکھڑی پر ہندوؤں کی بہت سی فیکٹریاں تباہ کر دیں۔ اس جنون کے وقت انھوں نے شہر کے ایک نہایت قیمتی شخص ڈاکٹر پربھات سنگھ پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ وہ وہیں سڑک پر مر گئے۔ اس دوران افواہ پھیلی کہ مسلمانوں نے اسٹیٹ بنک کالونی (ایک ہندو آبادی) کو تباہ کر دیا ہے۔ اس سے ہندوؤں میں مزید اشتعال پیدا ہوا۔ انھوں نے شاستری نگر وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ وہی کام شدید تر انداز میں کرنا شروع کیا جو مسلمانوں نے ہندو علاقہ میں کیا تھا۔

مسٹر پدم روشا (سابق ڈائرکٹر جنرل آف پولیس) کا ایک مضمون انگریزی اخبار

انڈین اکسپریس (۳۰ جون ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ یہ ایک بہت منصفانہ مضمون ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں میں عملی طور پر سب سے زیادہ دخل دو چیزوں کا رہا ہے۔ ایک جلوس اور دوسرے لاؤڈ اسپیکر۔ جلوس کے بارہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ انسانوں کے متحرک ہجوم کو دونوں فریق نہایت آسانی سے مظاہرۂ طاقت (Show of strength) کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ یہی معاملہ لاؤڈ اسپیکر کا ہے۔ ایک پُرجوش مقرر کی آواز عام حالات میں صرف اس کے قریبی افراد تک پہنچ سکتی تھی، مگر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اس کی گونج پوری بستی کے لئے چیلنج بن جاتی ہے۔

راقم الحروف کو مسٹر پدم روشا کی بات سے صد فی صد اتفاق ہے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلوس اور لاؤڈ اسپیکر دونوں کو یک طرفہ طور پر اور رضا کارانہ طور پر بالکل ترک کر دیں۔ اور اگر فریق ثانی جلوس نکالتا ہے تو اس سے تعرض نہ کریں۔ عرب ممالک میں آج یہ دونوں چیزیں مکمل طور پر ممنوع ہو چکی ہیں۔ اور وہاں کے مسلمان، مقامی اور غیر مقامی دونوں، اس ممانعت کو پوری طرح تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ یہی طریقہ وہ ہندستان میں بھی اختیار کر لیں۔ اس کے بعد سارے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اور ہمیں وہ وقفۂ تعمیر مل جائے گا جس کی آج کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

میرٹھ کے فساد پر جن اخبارات نے براہ راست اور غیر جانبدار رپورٹیں شائع کیں، ان میں سے ایک ممتاز نام ہندی ہفت روزہ "چوتھی دنیا" کا ہے۔ چوتھی دنیا (۳۱ مئی ۱۹۸۷) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۲ مئی کو ہاشم پورہ محلہ میں دو بجے دن میں پی اے سی کے پانچ چھ ٹرک پہنچے۔ ان کے ساتھ کچھ ٹرکوں میں فوجی جوان بھی تھے۔ انھوں نے محلہ کی تلاشی لے کر تقریباً ڈیڑھ سو جوانوں کو ٹرک میں بھرا اور پھر لے کر روانہ ہو گئے۔ یہ ٹرک تیزی سے چل کر مراد نگر کے کنارے بہنے والی گنگا نہر کے پل پر رکے۔ تب تک رات کے تقریباً آٹھ بج چکے تھے۔ یہیں ایک ٹرک میں بھرے دو درجن نوجوانوں کو کھڑا کر کے سامنے سے گولی ماردی گئی اور ان کی لاشیں نہر میں پھینک دی گئیں۔ اس کے بعد ٹرک پھر تیز رفتاری کے ساتھ چلے۔ تقریباً ساڑھے نو بجے رات کو مکن پور کے پاس ہنڈن نہر کے پل کے پاس باقی نوجوانوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی ماری گئی اور انھیں نہر

میں ڈال دیا گیا۔ یہ سب ہاشم پورہ کے مزدور مسلمان تھے۔

یہ قتل عام کیوں ہوا۔ اس کے بارہ میں چوتھی دنیا کے نامہ نگار نے میرٹھ جاکر تحقیقات کی تو قتل عام کی وجہ بھی سامنے آگئی۔ ہوا یہ کہ ۲۱ مئی کو مسلم اکثریتی علاقہ ہاشم پورہ کی ایک گلی سے چلی گولی سے سورج کنڈ کے ایک نوجوان پربھات کوشک (۲۴ سال) کی موت ہوگئی۔ پربھات کوشک شہر کے بااثر شہری اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریاستی یونٹ کی سکریٹری شکنتلا کوشک کا بھانجا تھا۔ گولی چلنے کے اس واقعہ میں شکنتلا کوشک کا بیٹا اتیج بھی زخمی ہوا تھا۔ مرنے والے پربھات کا ایک بھائی ستیش چندر میرٹھ چھاؤنی میں ہی فوج میں میجر کے عہدے پر ہے۔ جب اسے بھائی کی موت کی اطلاع ملی تو وہ بوکھلا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۲ مئی کو میڈیکل کالج میں پوسٹ مارٹم کے لئے رکھی پربھات کوشک کی لاش کو وہ ملازمین کو ڈرا دھمکا کر بغیر پوسٹ مارٹم کے ہی لے آیا۔ اس کے ساتھ کئی فوجی بھی تھے۔ اسی شام جب مسلمان نوجوانوں کو ٹرکوں میں بھرا گیا تو لوگوں نے میجر ستیش چندر کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ اس بات کا شک ہے کہ اس میجر کی اسکیم پر ہی یہ قتل عام کیا گیا (بحوالہ نئی دنیا ۱۵ جون ۱۹۸۷)

میرٹھ کے المیہ میں سب سے بڑا انسانی کردار ڈاکٹر ہرپال سنگھ کا ہے جس کی مثال میرے علم کی حد تک نہ ہندوؤں میں پائی جاتی ہے اور نہ مسلمانوں میں۔ ڈاکٹر ہرپال سنگھ میرٹھ کے این ایس کالج میں پولٹیکل سائنس کے استاد ہیں۔

۱۹ مئی ۱۹۸۷ کو صبح سحری کے وقت مسلح پولیس محلہ المیان (میرٹھ) میں داخل ہوگئی۔ اس نے محلہ والوں پر کافی ظلم کیا۔ اس کی خبر پھیلی تو اس محلہ سے چار فرلانگ دور ہاپوڑ روڈ پر بپھرے ہوئے مسلمان نکل آئے۔ انھوں نے انتقامی جذبہ کے تحت وہاں کے ہندوؤں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگانا شروع کر دیا۔ ہاپوڑ روڈ پر ہندوؤں کے تین پٹرول پمپ جلا دئے۔ اور بہت سے دوسرے نقصانات کئے۔

یہ دن کا وقت تھا۔ ڈاکٹر ہرپال سنگھ کے صاحب زادہ ڈاکٹر پربھات سنگھ اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہاپوڑ روڈ سے گزرے۔ غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں نے ڈاکٹر پربھات سنگھ کو پکڑا۔ ان کی گاڑی کو جلایا اور ان کے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ ڈاکٹر پربھات اس وقت

ایک مریض کے آپریشن کے لئے اسپتال جارہے تھے، مگر اس حادثہ کے بعد خود ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے اسپتال لے جائی گئی۔

ڈاکٹر ہرپال سنگھ اور ان کے بیٹے دونوں حد درجہ شریف اور انسان دوست آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی حمایت کرتے تھے۔ ان کی اعلیٰ شرافت کا مزید ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عزیز بیٹے کی اس دردانگیز ہلاکت پر مسلمانوں کے خلاف کوئی بھی سخت بات نہیں کہی۔ جب وہ اپنے جوان اور اکلوتے بیٹے کی جلی ہوئی ہڈیاں لئے ہوئے گھر واپس آرہے تھے تو راستہ میں انھوں نے ہندوؤں کی بھیڑ دیکھی جو مسلمانوں کے خلاف شدید طور پر بپھری ہوئی تھی اور مسلمانوں کو جلانے مارنے پر آمادہ تھی۔ انھوں نے بھیڑ کو منع کیا۔ کسی نے کہا کہ تم ان لوگوں کی طرفداری کررہے ہو جنھوں نے تمہارے جوان بیٹے کو بلاسبب مار ڈالا۔ ڈاکٹر ہرپال سنگھ نے جواب دیا: "اگر پربھات میرا بیٹا تھا تو تم جس کو جلانے مارنے جارہے ہو وہ بھی تو کسی کا بیٹا ہوگا۔"

ڈاکٹر ہرپال سنگھ کا ایک بیان بے حد قابل غور ہے۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا:

"میرا اب تک مسلمانوں کے بارہ میں یہ خیال تھا کہ وہ صرف اپنے دفاع کی لڑائی لڑتے ہیں۔ وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے۔ لیکن میرٹھ شہر میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مسلمان نہ جانے کیوں بھڑک اٹھا۔ انھیں کس نے بھڑکایا ہے کہ وہ اس طرح سڑکوں پر نکل آئے اور آگ زنی شروع کردی؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ حالاں کہ اس کام میں پیش پیش غنڈہ اور جرائم پیشہ عناصر ہی تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ شریف اور مہذب و معزز لوگ بھی تماشائی بنے رہے۔ انھوں نے روکا نہیں۔ وہ روکتے تو شاید میرا بیٹا بچ جاتا۔"

میرٹھ کے ڈاکٹر اتول بھٹناگر (کمل نرسنگ ہوم) نہایت شریف اور انسان دوست آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر ۵۰ مسلمانوں کو بچایا جو ۱۸ مئی کو ان کے نرسنگ ہوم میں موجود تھے۔ اس کی قیمت انھیں یہ ملی کہ ان کے ہم قوم انھیں غدار کہہ رہے ہیں اور ان کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اتول بھٹناگر نے کہا کہ ۱۸ مئی کی رات کو تقریباً ۱۰½ بجے سکھ بیر سنگھ اور اس کا بہنوئی زخمی حالت میں ان کے نرسنگ ہوم میں آئے۔ دونوں کے جسم پر تیزاب اور شیشے کے زخم تھے۔

انھوں نے بتایا کہ ہم آرہے تھے کہ محلہ المیان پر لوگوں کی بھیڑ اکھٹا تھی جس نے ہم پر کانچ کی بوتلوں اور پتھروں سے حملہ کیا اور ہمارے اوپر تیزاب پھینکا۔ ہم بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر یہاں آئے ہیں (افکار جون ۱۹۸۷)

میرٹھ میں اور دوسرے مقامات پر بہت سے ہندوؤں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کو بچایا۔ اس قسم کے تجربات مسلمانوں کے ساتھ بار بار پیش آتے ہیں۔ مگر مسلمان یہ کرتے ہیں کہ جو ہندو ان سے اچھا سلوک کرتا ہے اس کو وہ "فرد" کے طور پر لیتے ہیں اور جو ہندو برا سلوک کرتا ہے اس کو وہ پوری کمیونٹی پر پھیلا دیتے ہیں۔

ہم لوگ میاں محمد نگر (کھتہ روڈ) پر گئے۔ یہاں کا منظر اتنا بھیانک تھا کہ اس کو نہ قلم بیان کر سکتا ہے اور نہ کیمرہ۔ میاں محمد نگر گاؤں کی مانند ایک بستی تھی۔ تنگ گلیوں کے دونوں طرف لوگوں نے پچاس گز یا اس سے کم یا زیادہ زمینیں خرید کر چھوٹے چھوٹے پختہ مکان بنائے تھے۔ ان مکانات کی تعداد تقریباً ۲۸۰ تھی۔ یہ لوگ محنت مزدوری کر کے ان میں زندگی گزار رہے تھے۔ اچانک ایک روز پی اے سی کے ساتھ ایک غول آیا جس میں زیادہ تر ہریجن تھے۔ ان کے پاس خاص طرح کے کیمیکل تھے۔ وہ گھروں کو لوٹتے اور کیمیکل چھڑک کر آگ لگا دیتے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو یہ منظر تھا کہ مکانات کی دیواریں تو کھڑی ہوئی تھیں مگر چھت سب کی گر چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شدید بمباری سے تمام مکانات ڈھ پڑے ہوں۔ میں نے دیکھا مرد، عورتیں اور بچے اپنے مکان کے کھنڈروں پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں ان کے پاس نہ سایہ کی کوئی جگہ ہے اور نہ کھانے پینے کا یا زندگی کا اور کوئی سامان۔

میاں محمد نگر کے اس کھنڈر کو دیکھ کر ہم باہر سڑک پر آئے تو ایک پولیس پارٹی اس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ آگے آگے ایک پولیس افسر تھا۔ پیچھے چار سپاہی رائفلیں لئے ہوئے اس کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ ان کے داخلہ کا انداز ایسا تھا جیسے فاتح اپنے مفتوح کے علاقہ میں داخل ہو رہا ہو۔ وہ معاوضہ کی فہرست تیار کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔

میرٹھ سے واپسی کے بعد اگلے دن میں نے ہندستان ٹائمس (۲۹ جون ۱۹۸۷) میں مسٹر رومیش بھنڈاری کا مضمون پڑھا۔ مسٹر بھنڈاری فارن سکریٹری کے عہدہ سے ابھی حال میں ریٹائر ہوئے ہیں۔

یہ مضمون سری لنکا کے موجودہ حالات کے بارہ میں ہے۔ اس میں انھوں نے ہندستان کی طرف سے کسی فوجی مداخلت کو خارج از بحث قرار دیا ہے اور تصفیہ بذریعہ ترغیب (Settlement by persuasion) کی وکالت کی ہے۔ میں نے سوچا کہ ہندستانی سیاست کا یہی تضاد ہے جو ہندستان کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ یہ ملک "میاں محمد نگر" کے غریبوں پر گولی چلاتا ہے اور جس کو طاقت ور دیکھتا ہے اس کے مقابلہ میں فوراً ترغیب (Persuasion) کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ہمیں اس ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ہمیں اپنی قومی زندگی کے اس تضاد کو ختم کرنا ہوگا۔

میرٹھ کی کہانی کا سب سے زیادہ وحشتناک باب وہ ہے جو ملیانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ملیانہ گویا وسیع تر میرٹھ کا ایک محلہ ہے جو شہر کی بیرونی سمت میں واقع ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً ۲۵ ہزار ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۴ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۸۷ کو دو ٹرک مسلح پولیس آئی اور چھتوں پر چڑھ کر مسلم علاقہ میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں ۷۳ مسلمان ہلاک ہو گئے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان باہم مل جل کر رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک یہاں ایک بار بھی کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

ایسی حالت میں ۲۳ مئی کا واقعہ کیوں ہوا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۸۸ کو ملیانہ کے تین آدمی ہمارے دفتر میں آئے۔ نصیر احمد صاحب، افتخار علی صاحب اور آصف اختر صاحب۔ یہ لوگ مذکورہ حادثہ کے دن ملیانہ میں موجود تھے۔ ان سے گفتگو کے دوران جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ میرٹھ فساد کے موقع پر اسلام آباد محلہ کے مسلمانوں نے جم کر پولیس کا مقابلہ کیا اور علاقہ کے ہندوؤں کو نقصان پہنچایا۔ پولیس یہاں کے مسلمانوں کو دبانے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ اسکیم بنائی کہ قریب کے علاقہ (ملیانہ) میں انتقامی کارروائی کرے تاکہ میرٹھ (اسلام آباد) کے مسلمانوں کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔ حالاں کہ خود ملیانہ کے مسلمانوں نے کسی قسم کی کوئی اشتعال انگیز کارروائی نہیں کی تھی۔

جس وقت ملیانہ میں مسلمانوں کو مارا جا رہا تھا اور ان کے گھروں کو جلایا جا رہا تھا، وہاں کے ایک باشندہ اعجاز علی صدیقی نے ایک پولیس افسر سے کہا جو وہاں موجود تھا، آپ ان نہتے لوگوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے۔ پولیس افسر نے جواب دیا: ہم یہاں مسلمانوں کو بچانے کے لئے نہیں آئے ہیں، ہم ان کو سبق دینے کے لئے آئے ہیں۔

ملیانہ میں جس بے دردی کے ساتھ پولیس نے مسلسل دو گھنٹہ تک گولی چلائی، اس نے عالمی سطح پر ضمیر کو بیدار کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل (لندن) کی مفصل رپورٹ اس سلسلہ میں اخبارات میں آچکی ہے۔ اس رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ نومبر ۱۹۸۷) میں بتایا گیا تھا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ذمہ داروں نے اس سلسلہ میں لندن کے ہندستانی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیا۔ سفارت خانہ نے جواب دیا کہ ——— یہ یقین کرنے کا معقول سبب موجود ہے کہ سماج دشمن عناصر نے پولیس کے یونیفارم چرا لئے اور ان کو پہن کر گولیاں چلائیں :

There is reason to believe that police uniforms were stolen and used as a disguise by anti-social elements.

سفیر ہند کی یہ توجیہہ نہایت عجیب ہے۔ مگر آج کل ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ جہاں اس کی اپنی ذات زد میں آئے وہاں ہر آدمی "سفیر ہند" بن جاتا ہے۔ انسان کو اگر اس کی غلطی یاد دلائی جائے تو اس کو اخذ کرنے کے لئے اس کی عقل عاجز ثابت ہوگی۔ مگر جب اپنی غلطی کی جھوٹی توجیہہ تلاش کرنا ہو تو ہر آدمی آخری حد تک ذہین بن جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی یہ ذہانت صرف اس کے جرم میں اضافہ کر رہی ہے۔ ایسا آدمی یہ خطرہ مول لے رہا ہے کہ خدا کی عدالت میں اس سے یہ کہا جائے کہ جب تم اپنی غلطی کی تردید کرنے میں اتنے ہوشیار تھے تو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں اتنے بے وقوف کیوں بن گئے۔

میرٹھ کے فساد کی رپورٹوں میں جو الفاظ بار بار اخبارات میں آئے ان میں سے ایک نام "زیدی فارم" کا تھا۔ یہ سید محمد علی زیدی کے نام پر مشہور ہے۔ ہم ان کے مکان پر گئے۔ اتفاق سے موصوف اس وقت موجود نہ تھے۔ ان کی بہن نایاب زیدی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک معمر خاتون ہیں اور ایم ایس سی اور بی ایڈ کئے ہوئی ہیں۔

خاتون نے بتایا کہ خود زیدی فارم میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ البتہ آس پاس میں کچھ واقعات ہوئے۔ محترمہ نایاب زیدی سے میں نے پوچھا کہ اس کا حل کیا ہے۔ ان کا جواب یہ تھا "اس کا حل صرف محبت ہے، اور کچھ نہیں"۔ انھوں نے اپنے مالی رام داس سے ملایا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہے۔ وہ زیدی ہاؤس میں بارہ سال سے مالی کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ رام داس

مالی بے حد سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ جو کچھ میرٹھ میں ہوا تو اب کیا کیا جائے کہ پھر ایسا نہ ہو۔ انھوں نے جواب دیا: کہیں ہندوؤں کا زور ہے تو ان کو محبت سے پیار سے رکھیں۔ یہ سب سے زیادہ صحیح بات ہے جو میرٹھ میں مجھے ایک مالی کی زبان سے سننے کو ملی، مگر یہی وہ بات ہے جو ہمارے بڑے بڑے عالموں تک کو نہیں معلوم۔

ایک صاحب نے کہا کہ میرٹھ کا فساد پلاننگ کے تحت ہوا۔ یعنی ہندوؤں نے پہلے سے پلان بنا کر مسلمانوں کو مارا۔ انھیں صاحب نے مسلمانوں کی بہادری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہا کہ پہلے دن جب تک پولیس نہیں آئی تھی مسلمانوں نے زیادہ مارا۔ مگر جب مسلح پولیس (پی اے سی) آگئی تو مسلمان زیادہ مارے جانے لگے۔ میں نے کہا کہ اگر پلاننگ یک طرفہ تھی تو مسلمان کیسے اس قابل ہو سکے کہ وہ پہلے دن زیادہ ماریں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو جواب میں تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔

میں نے کہا کہ یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ فریق ثانی اگر بالفرض فساد کی پلاننگ کر رہا ہے تو اس کا مقابلہ جوابی فساد کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ تدبیر سے آپ ان کی پلاننگ کو فیل کر دیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال کے طور پر غزوۂ خندق کے موقع پر عمل فرمایا۔ فریق ثانی بہت بڑی تعداد میں تیار ہو کر لڑنے کے لئے آ رہا تھا، مگر آپ نے ایک ایسی آڑ قائم کر دی کہ دونوں کے درمیان ٹکراؤ کی عملی صورت ہی ختم ہو گئی۔

حالیہ فسادات کے زمانہ میں مختلف لوگوں نے نہایت طاقتور الفاظ میں فساد کو برا کہا ہے اور امن کے ساتھ رہنے کی وکالت کی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ باتیں عملی طور پر بالکل بے کار ہیں۔ اس لئے کہ وہ متعین انداز میں نہیں کہی گئی ہیں۔ وہ "فساد" کے خلاف ہیں نہ کہ "مفسد" کے خلاف۔

مثلاً انڈین اکسپریس (۳۰ جون ۱۹۸۷) نے اپنے صفحہ ۶ پر ایک شخص کا یہ قول نقل کیا:

> Man's liberty ends, and it ought to end, when that liberty becomes the curse of his neighbours.

آدمی کے لئے آزادی کا حق ختم ہو جاتا ہے اور اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ جب کہ یہ آزادی اس کے پڑوسی کے لئے لعنت بن جائے۔

موجودہ شکل میں جو شخص اس قول کو پڑھے گا وہ اس کو دوسروں پر چسپاں کرے گا اور اپنے

آپ کو اس سے الگ کرلے گا۔ اس لئے صرف وہ تنقید مفید ہے جو متعین انداز میں کی جائے۔ اس کی موزوں ترین صورت یہ ہے کہ ہندو اپنے فرقہ کی زیادتی پر انھیں ٹوکے اور مسلمان اپنے فرقہ کی زیادتی پر بولیں۔

ایک مسلمان نے کہا کہ "مقامی ہندی اخبارات نے میرٹھ کے فساد کو بھڑکانے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے ہندوؤں کے نقصانات کا ذکر کیا۔ نام بھی دئے۔ فوٹو بھی دئے۔ مگر مسلمانوں کے نقصانات کا کوئی بھی ذکر نہیں کیا۔"

یہ تنقید بھی کس قدر عجیب ہے۔ مسلمانوں کے تمام اخبارات یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کے نقصانات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے نقصان کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ یہ بات کسی مسلمان کو غلط نظر نہیں آتی۔ مگر یہی بات جب ہندو اخبار کرے تو وہ فوراً غلط ہو جاتی ہے۔ گویا اپنے لئے ایک اصول ہے اور غیر کے لئے دوسرا اصول۔ جو لوگ اس قسم کا غیر منصفانہ ذہن رکھتے ہوں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

مسٹر الیس کے چھابڑا نے اپنے ایک مطبوعہ خط (ہندستان ٹائمس ۶ جولائی ۱۹۸۷) میں لکھا ہے کہ یہ صرف ملا، پنڈت اور سیاست داں ہیں جنھوں نے ماحول کو خراب کیا ہے:

It is only the Mullahs, Pandits and politicians who have spoiled the atmosphere.

مجھے مسٹر چھابڑا کی اس بات سے صد فی صد اتفاق ہے۔ مسلم عوام اور ہندو عوام اگر تنہا ہوتے تو یقینی طور پر ان کے درمیان کوئی فرقہ وارانہ لڑائی نہ پیدا ہوتی۔ لیکن مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے سارا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

میرٹھ میں ہر سال جگناتھ کی رتھ یاترا کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ اس بار یہ جلوس ۲ جولائی ۱۹۸۷ کو نکالا گیا۔ ٹائمس آف انڈیا کے نامہ نگار مسٹر رمن نند نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سالانہ رتھ یاترا میں پہلے بمشکل ایک ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔ اس بار نہایت کثرت سے لوگ اس میں شریک ہوئے جن کی تعداد کا اندازہ ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے۔ رتھ یاترا کمیٹی کے ایک رکن مسٹر ستیہ پرکاش اہلووالیا نے پر فخر طور پر کہا کہ اس بار ہماری رتھ یاترا میں لاکھوں

آدمی شریک ہوئے۔

جلوس میں تعداد کا یہ اضافہ یقینی طور پر میرٹھ میں موجودہ حالات کی بنا پر ہوا ہے۔ یہ مسلمانوں کے جلسہ جلوس کا جواب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلسہ اور جلوس کا طریقہ کس طرح مسلمانوں کے لئے بے فائدہ بلکہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (Counter productive) ہے۔ مسلمان اگر جلسہ اور جلوس کا مظاہرہ کریں تو یہ ہندو کے اندر قومی ساکھ کے جذبہ کو ابھارے گا۔ وہ بڑھ چڑھ کر اپنا مظاہرہ کرنا چاہیں گے۔ سوئے ہوئے فتنے بیدار ہوں گے۔ حالات کی نزاکت میں اضافہ ہوگا ہندوؤں کا جلوس بند کرنے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنا جلوس بند کر دیں۔

میرٹھ کی کل آبادی تقریباً دس لاکھ ہے۔ اس میں مسلمان ۴۰ یا ۴۵ فی صد تعداد میں آباد ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ پچھلے پچاس سال کے اندر میرٹھ میں ۱۷ فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ آخری برسوں میں حسب ذیل سال میرٹھ میں فساد کے سال رہے ہیں۔ ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۷، ۱۹۶۸، ۱۹۷۳، ۱۹۸۲، ۱۹۸۶، ۱۹۸۷۔ ۱۹۸۲ کے فساد میں ۳۲ موتیں واقع ہوئی تھیں۔

یہ فسادات ہمیشہ معمولی نادانی سے شروع ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہ ہمیشہ چند افراد کی کسی غلط کارروائی سے شروع ہوتے ہیں۔ تاہم پورا معاشرہ اس کا مجرم قرار پاتا ہے کیوں کہ بقیہ لوگ ہمیشہ اپنے فرقہ کے شرپسند افراد کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ان کی مذمت نہیں کرتے۔ اس طرح چند لوگ اگر فساد انگیزی کے براہ راست مجرم ہیں تو بقیہ لوگ اس کے بالواسطہ مجرم۔ یہ فساد کس طرح معمولی نادانیوں سے شروع ہوتے ہیں، اس کو ۱۹۸۲ کے فساد کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

محلہ شاہ گھاٹ میں ایک چبوترہ کا جھگڑا تھا۔ وہاں ایک قبر اور ایک پیپل کا درخت تھا۔ ہندوؤں نے پیپل کو بنیاد بنا کر اس کو مندر کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ اور مسلمانوں نے قبر کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ کسی بزرگ کا مزار ہے اور وہاں چادر چڑھانے کا مطالبہ کیا۔

یہ جھگڑا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ۶ ستمبر اور ۷ ستمبر ۱۹۸۲ کی درمیانی رات کو کسی مسلمان نے وہاں کے پجاری کو قتل کر دیا۔ ۷ ستمبر کو جب پجاری کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو شہر میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور سارا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا۔

بیسیوں مسلمان قتل ہوئے۔ ہزاروں گھر لوٹے اور جلائے گئے۔ کروروں روپے کا مالی

نقصان ہوا (الجمعیۃ ڈیلی ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۲)

سردھنا کے الکٹریشین انعام الحق صاحب (پیدائش ۱۹۵۸) سے ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ کو ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ میرٹھ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ یہ بتلائیے کہ میرٹھ میں اتنا زیادہ فساد کیوں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۷ تک میرٹھ میں ۷ فرقہ وارانہ فساد ہو چکے ہیں۔ ایسا کہیں اور نہیں ہوا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

انھوں نے کہا: میرٹھ کا آدمی دبّو نہیں ہے۔ یعنی ایک کی بات دوسرے کو برداشت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر ہم کسی کو سمجھائیں تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم کیوں دبیں۔ چنانچہ وہاں اگر ایک مسلمان اور ایک ہندو میں کسی بات پر لڑائی ہو جائے تو وہ دو آدمی کی لڑائی نہیں رہتی۔ وہ فوراً ہندو مسلم لڑائی بن جاتی ہے۔ اسی لئے میرٹھ تباہ ہے۔

میرٹھ میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بار بار کمیونسٹ کا لفظ بولتے تھے۔ "کمیونسٹوں نے یہ سب کرایا ہے"، انھوں نے کہا۔ میں نے جاننا چاہا کہ کیا یہاں کمیونزم کا زور ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں کمیونزم کا یا کمیونسٹوں کا کوئی اثر نہیں۔ آخر کار کافی دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ وہ صاحب کمیونسٹ کا لفظ کمیونلسٹ (فرقہ پرست) کے معنی میں بول رہے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان تعلیم میں کتنا پیچھے ہیں۔ ہم نے یہاں بہت سے مسلمانوں سے ملاقات کی اور ان سے گفتگو کی مگر بہت کم ایسے افراد ملے جو باشعور ہوں اور واقعی طور پر معاملات کو سمجھتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا اصل مسئلہ ہندو تعصب یا ہندو فرقہ پرستی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا تعلیم میں پیچھے ہونا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت جاہل یا نیم خواندہ ہے۔ وہ کسی معاملہ میں گہرائی کے ساتھ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ حتی کہ یہاں کے لیڈر بھی اتنے ہی بے شعور ہیں جتنا کہ یہاں کے عوام۔ جب کسی قوم کی اکثریت جاہل ہو تو اس کے تعلیم یافتہ افراد بھی نیم تعلیم یافتہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میرٹھ کے ریلیف کی اپیلوں پر مسلمانوں نے کروڑوں روپے دئے ہیں۔ لیکن اگر میرٹھ کے مسلمانوں کو باشعور اور تعلیم یافتہ بنانے کا منصوبہ لے کر اٹھئے، تو نہ ریلیف فنڈ کھولنے والوں کو اس سے کوئی دلچسپی ہوگی اور نہ ریلیف میں بڑی بڑی رقمیں دینے والوں کو۔ قومی مصیبت کے لئے متحرک

ہونا اور قومی تعمیر کے لئے متحرک نہ ہونا زوال کی خاص علامتوں میں سے ہے۔ اور زوال کی اس قسم میں مسلمان پوری طرح مبتلا ہو چکے ہیں۔

علاء الدین صاحب (۴۲ سال) میرٹھ کے محلہ کوٹلہ میں رہتے ہیں۔ ان کی وہاں پان کی دکان ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فساد کے بعد جب شہر میں کرفیو نافذ ہوا تو لوگوں کا گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ ہم لوگ اپنی گلی میں بھی باہر نہیں آسکتے تھے۔ مگر ایک معمولی خوش تدبیری نے ہمارے لئے کرفیو کو آسان بنا دیا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک روز پی اے سی والے ہماری گلی کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکل کر گلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پی اے سی والوں نے کہا کہ تم لوگ باہر کیوں بیٹھے ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ یہاں سخت کرفیو لگا ہوا ہے۔ محلہ والوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، بلکہ نرمی کے ساتھ انھیں جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم لوگ ابھی گھروں کے اندر چلے جاتے ہیں۔ مگر جب آپ ہمارے محلہ میں آگئے ہیں تو ہماری طرف سے کچھ چائے پانی تو قبول کر لیجئے۔ اس کے بعد محلہ والوں نے ان کی تواضع کی۔ تواضع سے فارغ ہو کر جب پی اے سی والے باہر جانے لگے تو انھوں نے کہا: آپ لوگ باہر رہنا چاہتے ہو تو رہو، البتہ دیکھو دنگا فساد مت کرنا۔ محلہ کوٹلہ کے لوگوں نے اس طرح کئی بار پی اے سی والوں کی تواضع کی اور ان کے محلہ میں پی اے سی کا رویہ بہت نرم رہا۔

عین فساد کے زمانہ میں اس طرح کے اور بھی کئی واقعات میرٹھ میں ہوئے۔ مثال کے طور پر متین صدیقی صاحب کا تجربہ بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ خیر نگر (ٹیلی فون ۳۵۳۱) میں رہتے ہیں۔ ان کے سامنے کی سڑک پر پی اے سی کا کیمپ تھا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ ایک روز پی اے سی والوں نے متین صدیقی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پانی مانگا۔ انھوں نے فوراً ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس بھیج دیا۔ اس طرح بار بار وہ لوگ ان کے یہاں سے ٹھنڈا پانی لیتے رہے۔ اس کے بعد جب کرفیو زیادہ سخت ہوا تو اب پی اے سی والوں کی باری تھی۔ ایک روز دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو پولیس کا آدمی ایک بنٹی (بالٹی) دودھ لئے ہوئے کھڑا تھا۔ اسی طرح وہ انھیں سبزی وغیرہ پہنچاتا رہا۔ متین صدیقی صاحب نے قیمت دینا چاہا تو انھوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

یہ اسی میرٹھ کے واقعات ہیں جہاں کے بارہ میں مسلم لیڈر اور مسلم اخبارات نے صرف پولیس کے ظلم اور تشدد

کی خبریں دنیا کو سنائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس والے بھی انسان ہیں۔ ان کے سینہ میں بھی دل ہے۔ آپ غیر حکیمانہ سلوک سے انھیں اپنا دشمن بنا سکتے ہیں۔ اور اگر آپ حکیمانہ سلوک کریں تو یقیناً آپ ان کو اپنا دوست پائیں گے۔

امید افزا رجحان

موجودہ فسادات کے بعد عام طور پر ایک ایسے رجحان کا اظہار ہوا ہے جس کو "فطرت انسانی کا احتجاج" کہا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ہندی اور انگریزی اخبارات پڑھتے ہیں، انھوں نے کثرت سے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہاں ہم صرف چند مثالیں نقل کریں گے۔

مسٹر نکھیل چکرورتی فرقہ وارانہ دنگے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہم اب غیر انسانی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک فرقہ وارانہ فساد اب ہمارے ضمیر میں ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ اس کے متعلق ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن میں سنتے ہیں۔ مگر انسانی مصیبت کی اصطلاحوں میں نہیں، بلکہ شماریات کی زبان میں، اتنے آدمی ہلاک ہوئے، اتنے آدمیوں کو چھرا مارا گیا، اتنی دکانیں لوٹی گئیں، اتنے مکان جلائے گئے، بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں:

> We are getting dehumanised. A communal riot no longer seems to stir our conscience. We read about it in newspapers or hear about it over the radio and television—not in terms of human suffering, but in terms of bare statistics—so many killed, so many stabbed, so many shops looted or houses gutted. Nothing more.

ایک اور مثال مسٹر کے آر ملکانی کی ہے۔ ماضی میں وہ آرگنائزر کے اڈیٹر کی حیثیت سے کافی بدنام رہ چکے ہیں۔ مگر حالیہ واقعات نے غالباً ان کے ضمیر کو جگا دیا ہے۔ ان کا ایک مفصل مضمون اخبار اسٹیٹسمین (۳۰ مئی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت معتدل اور متوازن مضمون ہے۔ اس میں کسی بھی اعتبار سے مسلمانان ہند کے خلاف کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ بلکہ ہر اعتبار سے ان کا دفاع کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی (Blood brothers) کہا گیا ہے۔ یہ مضمون انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں ہم صرف اس کا آخری پیراگراف نقل کرتے ہیں:

> If Hindus and Muslims ponder over these matters dispassionately and respond to suggestions positively, the ground could be prepared for a great reconciliation in the subcontinent. That will be a great day for all mankind.

اگر ہندو اور مسلمان ان باتوں پر جذبات سے الگ ہو کر غور کریں اور ان تجویزوں کو مثبت طور پر لیں تو برصغیر میں ایک عظیم اتحاد کی زمین تیار ہو سکتی ہے۔ یہ تمام انسانیت کے لئے ایک عظیم دن ہوگا۔

اخبار پرتاپ (دہلی) اپنی جارحانہ فرقہ پرستی کے لئے کافی بدنام رہا ہے۔ مگر حالیہ فسادات کے بعد وہ بھی تڑپ اٹھا ہے۔ اڈیٹر پرتاپ مسٹر انل نریندر نے اپنے ایک مفصل اداریہ میں ابتداءً بابری مسجد کے تین حل پیش کئے ہیں۔ (۱) مسجد اور مندر دونوں ساتھ ساتھ رہیں (۲) تاریخی ریکارڈ دیکھ کر فیصلہ کیا جائے (۳) بابری مسجد کی عمارت کو اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"اگر مندرجہ بالا تینوں راستوں میں سے ایک بھی راستہ دونوں کو قبول نہ ہو تو میں ہاتھ جوڑ کر اپنے ہندو بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ اپنی خاطر، اپنے دیش کی خاطر آپ یہ قبول کر لیں کہ اس جگہ پر پھر سے تالا لگا دیا جائے اور اسے اسی حالت میں پہنچا دیا جائے جہاں وہ یکم فروری ۱۹۸۶ کو جج پانڈے کے فیصلے سے پہلے تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس سجھاؤ سے میرے کئی ہندو بھائی متفق نہ ہوں گے لیکن انھیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ دیش کی خاطر ایکتا کی خاطر، آخر کچھ قربانی دینی ہی پڑے گی۔ کب تک ہم اپنے ہندو بھائیوں کو دنگوں کی آگ میں تباہ برباد ہوتے دیکھتے رہیں گے۔ کیا تین سو کروڑ کا نقصان کافی نہیں؟ کتنی جانیں گنوانی پڑیں گی؟ کتنے کروڑ کا مزید نقصان برداشت کرنا ہوگا اس ایک جگہ کے لئے" (پرتاپ یکم جون ۱۹۸۷)

انڈین اکسپریس (یکم جون ۱۹۸۷) نے دہلی کے فساد کے بارہ میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے:

Cost of a riot

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دہلی میں ۲۲ مئی ۱۹۸۷ کو جو فساد شروع ہوا، اس میں جو انسانی جانیں ضائع ہوئیں، ان کے نقصان کا تو کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس سلسلہ میں ہونے والے مالی نقصان کا اندازہ ایک حد تک کیا جا سکتا ہے۔ رپورٹر کا کہنا ہے کہ وہ پرانی دہلی کے بڑے بڑے تاجروں سے ملا اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ اس فساد کے نتیجہ میں جب کرفیو نافذ ہوا اور تقریباً تین ہفتے کے لئے ہول سیل مارکٹ بند رہا تو اس سے انھیں کیا نقصان

پہنچا۔

دہلی ٹریڈ ایسوسی ایشن کے وائس پریسیڈنٹ مسٹر منوہر لال کمار نے رپورٹر کو بتایا کہ کرفیو کے دنوں میں پرانی دہلی کی ۳۰ ہزار سے زیادہ دکانیں بند رہیں۔ اس کے نتیجہ میں بجلی کا غذ، سونا چاندی، لوہے کا سامان، رنگ، بساطہ، غلہ، کپڑا وغیرہ کے تھوک کاروبار پر اثر پڑا۔ اور مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ کروڑ روپیہ روزانہ کے کاروبار کا نقصان ہوا۔

مسٹر پی راج گوپال نے اس تجارتی نقصان کو ایک جزیرۂ امید (Island of hope) قرار دیا ہے۔ انھوں نے ایک مضمون (انڈین اکسپریس یکم جون ۱۹۸۷) میں کہا ہے کہ بہت سے مقامات پر کاروبار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے پر انحصار (Interdependence) فساد کے خلاف ایک روک کا کام کرے گا ——— حالیہ فساد کے بعد ہندو صاحبان کے نقطۂ نظر میں "تبدیلی" کا سبب غالباً یہی واقعہ ہے۔

مسٹر پی آر راج گوپال سنٹرل ریزرو پولیس فورس (CRPF) میں تھے۔ وہ اس سے ڈائرکٹر جنرل (D.G.) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

Communal Violence in India (1987)

مسٹر راج گوپال نے اپنے طویل تجربات کی روشنی میں فرقہ وارانہ فسادات پر ایک مضمون شائع کیا ہے جو انڈین اکسپریس (۲۳ مئی ۱۹۸۷) میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ میں اس ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کا براہ راست مشاہد ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا ہمارے امیدوں اور خوابوں والے ہندستان کو:

Every successive communal riot deals a body blow not so much to the Hindus or the Muslims but to the India of our hopes and dreams.

مسٹر راج گوپال کی یہ بات صد فی صد درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات جو ۱۹۴۷ سے لے کر آج تک مسلسل جاری ہیں، ہندستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ میرٹھ اور دہلی کے حالیہ فساد کے بارہ میں بیان دیتے ہوئے وزیر اعظم راجیو گاندھی

نے کہا:

Nothing—I repeat, nothing—is more damaging to our nationhood and our future than the cancer of communalism. India will survive as a secular India or not at all.

کوئی چیز، میں بتکرار کہتا ہوں کہ کوئی چیز ہماری قومیت اور ہمارے مستقبل کے لئے اتنا نقصان دہ نہیں ہے جتنا کہ فرقہ واریت کا سرطان۔ ہندستان یا تو سیکولر ہندستان کے طور پر زندہ رہے گا یا وہ سرے سے مٹ جائے گا (ٹائمس آف انڈیا، ۲۳ مئی ۱۹۸۷)

یہ فسادات بتاتے ہیں کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حقیقت پسندی کو کھو دیا ہے، اور جو لوگ حقیقت پسندی کو کھو دیں ان کا انجام اس دنیا میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ تمام کے تمام ہندو یا تمام کے تمام مسلمان فسادی ہو گئے ہیں۔ اس قسم کا فساد کرنے والے ہمیشہ کم تعداد میں ہوتے ہیں اور یقینی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی وہ کم تعداد ہی میں ہیں۔ مگر اصل المیہ یہ ہے کہ فسادی لوگ جب فساد کرتے ہیں تو بقیہ لوگ ان کا ہاتھ نہیں پکڑتے۔ بلکہ فوراً اس کو قومی مسئلہ بنا کر اپنی قوم کے فسادیوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں نے وطن پرستی کا یہ کلمہ وضع کیا تھا کہ میرا ملک، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر ہو:

My Country, right or wrong

ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے معمولی ترمیم کے ساتھ اس کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ میرا فرقہ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط:

My community, right or wrong

چنانچہ ہر فساد کے بعد یہ ہوتا ہے کہ مسلم رہنما یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو برا بھلا کہنا شروع کرتے ہیں اور ہندو رہنما یک طرفہ پر مسلمانوں کو۔ ان میں کوئی بھی نہیں جو خود اپنی قوم کا محاسبہ کرے۔ اسی کا نام فرقہ پرستی ہے اور اس فرقہ پرستی نے ملک کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔

میرٹھ ایک چیتاونی ہے۔ مسلمانوں کے لئے، ہندوؤں کے لئے اور سارے ملک کے لئے

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۴۵

۱۔ دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے زیر اہتمام ۱۵ اگست ۱۹۸۸ کو اہل علم کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر لوگوں نے حسب ذیل عنوان پر اظہار خیال کیا:

Building bridges with the people of Pakistan

منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔

۲۔ کالی کٹ (کیرلا) سے ایک ہفتہ وار پرچہ ملیالم میں نکلتا ہے۔ اس کا نام شباب ہے۔ اس پرچہ میں ہر ہفتہ الرسالہ یا مطبوعات الرسالہ سے کسی مضمون کو ملیالم میں ترجمہ کرکے شائع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اور کئی پرچے ہیں جو مختلف زبانوں میں الرسالہ کے مضامین شائع کر رہے ہیں۔

۳۔ دہلی کے ایک جرنلسٹ مسٹر آر بی ایل نگم نے صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا تھا۔ یہ انٹرویو گوالیار کے ہندی روزنامہ سُوو دیش نے اپنے شمارہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۸ میں شائع کیا ہے۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ہیں۔

۴۔ ایک ہندی اسٹیٹ سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ وہ وہاں کے ہندو صاحبان کو الرسالہ پڑھا رہے ہیں۔ ایک ہندو نوجوان نے دو سال الرسالہ پڑھنے کے بعد کہا کہ "میں کٹر آر ایس ایس کا آدمی تھا۔ مگر آپ کے رسالہ نے مجھ کو بالکل بدل دیا"۔ اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس ملک میں جارحانہ فرقہ پرستی کا جو مسئلہ ہے، اس کو حل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے۔ بلکہ ان کا حل یہ ہے کہ اسلام کا مثبت تعارف ان کے سامنے لایا جائے۔ یہی کام الرسالہ کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔

۵۔ ایک صاحب اپنے خط ۲۵ اگست ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں تقریباً ۵۰ عدد الرسالہ اطراف کے لوگوں تک فرداً فرداً پہنچاتا ہوں۔ یہ کام تین دن میں ختم ہوتا ہے۔ فرداً فرداً دینے میں عظیم فائدہ ہے۔ شکوک کا ازالہ وغیرہ۔ مرکز کی تمام کتابیں مع تذکیر القرآن مختلف حضرات تک برائے مطالعہ پہنچانا، پھر کتابوں کا واپس لانا تاکہ دوسروں تک پہنچائی جاسکیں۔ اس طرح صبح و شام گزر رہے ہیں۔ مزید کوشش کی جائے تو ہمارے علاقہ میں الرسالہ ہزاروں کی تعداد میں نکل سکتا ہے۔ (ڈاکٹر انوار الحق، امباری)

۶۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۲۰ اگست ۱۹۸۸ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک مفصل خطاب کیا جس کا عنوان تھا: عقیدۂ آخرت کا عقلی ثبوت۔ قرآنی آیات کی روشنی میں مذکورہ موضوع کی تفصیل بیان کی گئی۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۷۔ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے نئی دہلی میں ایک تین روزہ سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار، مولانا ابو الکلام آزاد کے بارہ میں تھا اور اس کا افتتاح ڈاکٹر شنکر دیال شرما (وائس پریسیڈنٹ) نے کیا۔ ۲۱ اگست ۱۹۸۸ کی نشست کا چیرمین صدر اسلامی مرکز کو بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی اور صدارتی تقریر کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مذکورہ نشست کا موضوع بحث تھا: مولانا آزاد کی الٰہیاتی تخلیقیت (Theological creativity) یہ سیمنار رابندر بھون (نئی دہلی) میں ہوا۔

۸۔ الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے مغربی ملکوں میں پھیل رہا ہے۔ کچھ لوگ انفرادی طور پر اور کچھ لوگ ایجنسی کے طور پر منگا رہے ہیں۔ حال میں روم (اٹلی) کے ایک ادارہ نے انگریزی الرسالہ کی کاپیاں بطور ایجنسی منگانا شروع کیا ہے۔ الرسالہ کے ہمدردوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے حلقۂ تعارف میں لوگوں کو اس طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کریں۔ یا تو ایجنسی لے کر اس کو پھیلائیں یا اپنی طرف سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے نام اس کو جاری کروائیں۔

۹۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے صوفیا (بلغاریہ) میں ایک کلچرل نمائش منعقد کی گئی۔ یہ نمائش ۲۵ جون سے ۲ جولائی ۱۹۸۸ تک جاری رہی۔ اس نمائش میں دوسری چیزوں کے علاوہ ہندستان کی چھپی ہوئی منتخب کتابیں بھی رکھی گئیں۔ ان میں اسلامی مرکز کی چار انگریزی کتابیں بھی شامل تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

God Arises, Mohammad: The Prophet of Revolution, Religion and Science, Tabligh Movement

اس کے علاوہ بلغاریہ کی بین اقوامی نمائش میں بھی یہ کتابیں رکھی گئیں جس کی خبر پہلے آچکی ہے۔

۱۰۔ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

اس کا عنوان تھا: قربانی کا تصور اسلام میں۔

۱۱۔ اردو اکادمی دہلی نے کچھ اردو کتابوں پر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں صدر اسلامی مرکز کی کتاب "خاتونِ اسلام" بھی شامل ہے۔ اردو اکادمی نے اس کتاب پر تین ہزار روپیہ انعام کا فیصلہ کیا ہے۔ واضح ہو کہ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا ہے اور دوسرا ایڈیشن تقریباً سو صفحات کے اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ مذکورہ کتاب پر یہ انعام ۱۳ ستمبر ۱۹۸۸ کو ایک خصوصی تقریب میں اردو اکادمی کے چیرمین مسٹر روہیش بھنڈاری (لفٹننٹ گورنر دہلی) نے پیش کیا۔ یہ تقریب کمانی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں منعقد کی گئی۔

۱۲۔ الرسالہ کا تعمیری اور حقیقت پسندانہ مشن خدا کے فضل سے عمومی مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی صفوں میں کھلبلی پیدا ہو گئی ہے جو خطابت اور لفاظی کے ذریعہ قوم کے اندر قیادت کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے الرسالہ کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے بے بنیاد پروپیگنڈے شروع کر دیئے ہیں۔ اس کی ایک مثال ایک حلقہ قیادت کا پندرہ روزہ پرچہ ہے۔ اس نے ہمارے بارہ میں ان الفاظ کے ساتھ ایک جوابی مضمون شائع کیا ہے کہ "بعض اہل قلم ہندستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ دوسرے درجہ کا شہری ہونے پر قناعت کر لیں۔ پارسیوں اور مارواڑیوں کی طرح زندگی گزاریں" (۱۰ اگست ۱۹۸۸) بوکھلاہٹ میں مضمون نگار کو یاد نہ رہا کہ وہ اپنی تردید آپ کر رہے ہیں۔ پارسی اور مارواڑی، بالفاظ دیگر ٹاٹا اور برلا، کیا اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری ہیں اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حتی کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی باپ کی طرف سے پارسی ہیں، کیا وہ اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری ہیں اور کیا ان کو بھی پچھلی نشست پر جگہ ملی ہے۔ اس قسم کی جھوٹی تنقیدیں خود نام نہاد قائدین کے علمی اور فکری افلاس کا پردہ کھول رہی ہیں۔ وہ کسی بھی درجہ میں الرسالہ کے مشن کی صداقت کی تردید نہیں کرتیں۔

۱۳ "خاتونِ اسلام" کا نیا اڈیشن ۲۸۰ صفحات پر چھپ کر آگیا ہے۔ ڈیڑھ سو سال سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اسلام عورت کا رتبہ گراتا ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار جدید علمی اور استدلالی معیار پر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ جدید اسلامی لٹریچر میں یہ اپنے موضوع پر بالکل منفرد کتاب ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 November 1988 No 144

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Rs. 4